مواعظ حکیم الامت اور دینی رسائل کی اشاعت کا امین

ماہنامہ الامداد لاہور پاکستان

مدیر مسئول: (مولانا) ڈاکٹر احمد میاں تھانوی

مدیر: ڈاکٹر خلیل احمد تھانوی

جلد ۱۹ | ذی القعدہ ۱۴۳۹ھ | اگست ۲۰۱۸ء | شمارہ ۸

الرحمة علی الامة

حقیقتِ ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم

از افادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ

عنوانات و حواشی: ڈاکٹر مولانا خلیل احمد تھانوی

قیمت فی پرچہ =/۴۰ روپے | زرسالانہ =/۴۰۰ روپے

ماہنامہ الامداد لاہور

۳۵۴۲۲۲۱۳
۳۵۴۳۳۰۴۹

پتہ دفتر: جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ رجسٹرڈ
۲۹۱۔ کامران بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

ناشر: (مولانا) ڈاکٹر احمد میاں تھانوی

مطبع: ہاشم اینڈ حماد پریس
۱۳/۲۰ ریٹی گن روڈ بلال گنج لاہور

مقام اشاعت
جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ رجسٹرڈ لاہور پاکستان

الرحمة علی الامة

(حقیقتِ ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم)

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۱.....	حضرات صحابہ کرامؓ سے خصوصی برتاؤ کا حکم.....	۹
۲.....	حقیقت ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم.....	۱۰
۳.....	نئے رنگ کے مصنفین کی تصانیف.....	۱۱
۴.....	قدیم ہونا کوئی عیب نہیں.....	۱۲
۵.....	شان ملکیت شان نبوت کے تابع ہے.....	۱۳
۶.....	الفاروق علامہ شبلی کے بارے میں.....	۱۴
۷.....	حضرات خلفائے راشدینؓ کے اصل کمالات.....	۱۵
۸.....	رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اصلی شان.....	۱۵
۹.....	ذکر کی دو قسمیں.....	۱۷
۱۰.....	ہمیشہ ذکر میلاد.....	۱۸
۱۱.....	حکمت ذکر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم.....	۱۸
۱۲.....	حقوق العباد کی اہمیت.....	۲۰
۱۳.....	ایک پاجی کی حکایت.....	۲۲
۱۴.....	نجات کے لیے خالی محبت کافی نہیں.....	۲۳
۱۵.....	اعتراض کا جواب.....	۲۵
۱۶.....	جنت میں ہر شخص کے مذاق واستعداد کے مطابق سامان دیا جائیگا.....	۲۵
۱۷.....	کبھی سزا شرط راحت ہوتی ہے.....	۲۶
۱۸.....	دوزخ میں خیالی راحت بھی نہ ہوگی.....	۲۷

۱۹..... نافرمانی کے ساتھ محبت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم باعث نجات نہیں ۲۷
۲۰..... حقیقی محبت ۲۸
۲۱..... استخفاف معصیت کفر ہے ۲۹
۲۲..... معاصی کے باوجود محبت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک درجہ ... ۲۹
۲۳..... ایک غریب آدمی کی صاحبِ جاہ کو نصیحت ۲۹
۲۴..... وعظ ونصیحت کا ہر شخص اہل نہیں ۳۱
۲۵..... ہر ذکر موجب قرب نہیں ۳۲
۲۶..... ایک سبق آموز خواب ۳۳
۲۷..... مدح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں ضرورت اعتدال ... ۳۳
۲۸..... مضامین نعت میں گمراہ شعراء کا غلو ۳۵
۲۹..... شاعرانہ گستاخی ۳۶
۳۰..... حضرت یونس علیہ السلام کا قصہ اور ان پر فضیلت نہ دینے کی وجہ ۳۷
۳۱..... حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ملکوتی ۳۹
۳۲..... فضیلت ماہ ربیع الاول ۴۰
۳۳..... کاملین سے صدور خطا ممکن ہے ۴۱
۳۴..... نادان دوست ۴۲
۳۵..... احمق کی حکایت ۴۲
۳۶..... ناز ہر ایک کو زیبا نہیں ۴۳
۳۷..... کاملین کی غلطی کا راز ۴۴
۳۸..... شان نزول آیت متلوہ ۴۵
۳۹..... کثرت رائے کا حکم ۴۵
۴۰..... واقعہ احد ۴۶

۴۱.....	صحابہؓ کا حال.....	۴۷
۴۲.....	واقعہ وصال سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم.....	۴۸
۴۳.....	مقتضاء عشق.....	۴۸
۴۴.....	صحابہ کا طبعی ذوق.....	۴۹
۴۵.....	حکایت حضرت شاہ ابوالمعالی صاحب رحمۃ اللہ علیہ.....	۵۱
۴۶.....	حضرات صحابہؓ کی اجتہادی غلطی.....	۵۲
۴۷.....	صحابہ کی شان.....	۵۳
۴۸.....	رحمت خداوندی.....	۵۴
۴۹.....	رحمت خداوندی کا حق.....	۵۵
۵۰.....	حق سبحانہ وتعالیٰ کی عجیب رحمت.....	۵۵
۵۱.....	جاہل صوفیوں کی کوتاہیاں.....	۵۶
۵۲.....	جاہل واعظین.....	۵۷
۵۳.....	مسلمانوں پر رحمت خداوندی.....	۵۸
۵۴.....	اہل اللہ کے برابر کسی کو چین میسر نہیں.....	۵۹
۵۵.....	اہل اللہ کے غمگین نہ ہونے کا راز.....	۶۰
۵۶.....	اسباب راحت.....	۶۲
۵۷.....	محبت کا خاصہ.....	۶۳
۵۸.....	شان صحابہؓ.....	۶۴
۵۹.....	غزوہ تبوک اور واقعہ کعب بن مالکؓ.....	۶۵
۶۰.....	اصلاح میں نرمی اور سختی دونوں کی ضرورت ہے.....	۶۸
۶۱.....	نرمی کی اقسام.....	۶۹
۶۲.....	نیت کی حقیقت.....	۷۰
۶۳.....	مشائخ مبطلین کی غلطی کا منشاء.....	۷۰
۶۴.....	ایک لطیفہ.....	۷۲

۶۵	جلالت جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم	۷۳
۶۶	جدھر مولا ادھر شاہ دولا	۷۴
۶۷	حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حال	۷۴
۶۸	ایک علمی نکتہ	۷۵
۶۹	فاعف عنهم کی حکمت	۷۵
۷۰	جلالت شان رسول اکرم ﷺ	۷۶
۷۱	عظمت صحابہؓ	۷۷
۷۲	امور خیر میں استخارہ کا ثبوت	۷۸
۷۳	سرکار دوعالم ﷺ کے مشورہ فرمانے میں حکمت	۸۰
۷۴	قرآن حکیم سے سلطنت شخصی کا ثبوت	۸۱
۷۵	بعد مشورہ اللہ پر اعتماد کی ضرورت	۸۲
۷۶	توکل کا درجہ فرض	۸۳
۷۷	کمالات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم	۸۴

وعظ

الرحمة علی الامة
(حقیقتِ ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم .اما بعد

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ نے وعظ ''الرحمة علی الامة'' مسجد خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون ضلع مظفرنگر میں ۹ ربیع الاول ۱۳۴۵ھ کو بیٹھ کر اور کھڑے ہوکر بیان فرمایا جو کل ۳ گھنٹے جاری رہا۔ وعظ تقریباً ایک سو افراد نے سنا جبکہ مفتی مولانا عبدالکریم صاحب گمتھلی نے اسے قلمبند کیا۔

وعظ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے امت مسلمہ کیلئے عظیم رحمت ہونے کو بیان کیا اور بتایا کہ آپ کی محبت کا مقتضاء یہ ہے کہ آپ کا ذکر ہر دم کیا جائے کسی مہینہ اور دن کے ساتھ خاص نہیں لیکن اس کے بھی آداب ہیں کہ صرف آپ کے سراپا اور پیدائش وغیرہ ہی کا تذکرہ نہ ہو بلکہ آپ کے کمالات رسالت وغیرہ کا بھی تذکرہ ہو اہل حق بحمداللہ ان حقوق کی رعایت کرتے ہوئے ہمہ وقت ذکر میں مشغول رہتے ہیں ان پر یہ اعتراض درست نہیں کہ وہ تذکرہ میلاد مصطفیٰ میں کرتے۔ بہت ہی عمدہ وعظ ہے ہر خاص وعام کے لیے انتہائی مفید ہے۔

اللہ تعالیٰ تمام قارئین کو استفادہ کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

خلیل احمد تھانوی

۲۱ مارچ ۲۰۱۸ء

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

خطبۂ ماثورہ

الحمد للّٰہ نحمدہٗ و نستعینہٗ ونستغفرہٗ و نؤمن بہ ونتو کل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریك لہ ونشھد انّ سیدنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ اٰلہ واصحابہ وبارك وسلم **اما بعد:**

فاعوذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

﴿ فَبِمَا رَحۡمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنۡتَ لَهُمۡ ۚ وَلَوۡ كُنۡتَ فَظًّا غَلِيۡظَ الۡقَلۡبِ لَانۡفَضُّوۡا مِنۡ حَوۡلِكَ ۖ فَاعۡفُ عَنۡهُمۡ وَاسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ وَشَاوِرۡهُمۡ فِى الۡاَمۡرِ ۚ فَاِذَا عَزَمۡتَ فَتَوَكَّلۡ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُتَوَكِّلِيۡنَ ﴾(۱)

حضرات صحابہ کرامؓ سے خصوصی برتاؤ کا حکم

اس آیت مقدسہ میں جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو امر(۲) کیا گیا ہے اپنے خادموں یعنی صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ساتھ بعض معاملات میں خاص برتاؤ کا۔ یہ تو خلاصہ آیت کا ہے اور وجہ اس مضمون کے اختیار کرنے کی یہ ہے کہ بعض مہمانوں نے درخواست کی تھی وعظ کی ،اور خیال تھا کہ اس سے قبل وعظ میں جس آیت کا بیان تھا یعنی ﴿ قَدۡ جَآءَكُمۡ مِّنَ اللّٰهِ نُوۡرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيۡنٌ يَّهۡدِىۡ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضۡوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخۡرِجُهُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوۡرِ ﴾(۳)

---

(۱) ''یعنی بعد اس کے خدا ہی کی رحمت کے سبب آپ ان کے ساتھ نرم رہے اور اگر آپ تند خوسخت طبیعت ہوتے تو یہ آپ کے پاس سے سب منتشر ہوجاتے تو آپ ان کو معاف کردیجئے اور انکے لیے استغفار کردیجئے اوران سے خاص خاص باتوں میں مشورہ لیتے رہا کیجئے پھر جب آپ رائے پختہ کرلیں تو خدا پر اعتماد کیجئے۔ بے شک اللہ تعالیٰ ایسے اعتماد کرنے والوں سے محبت فرماتے ہیں'' سورۂ ال عمران:۱۵۹(۲) حکم دیا گیا ہے (۳) ''یعنی تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک روشنی آئی ہے اور ایک کتاب واضح کہ اس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ ایسے شخصوں کو جو رضائے حق کے طالب ہوں سلامتی کی راہیں بتلاتے ہیں اور ان کو اپنی توفیق سے تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے آتے ہیں'' المائدۃ:۵/۱۵۔۱۶۔

اسی کا اس وقت بھی بیان کرنا جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہادی کامل ہونا بیان کیا گیا ہے کیونکہ پہلے بیان میں تمہید ہی اتنی طویل ہوگئی تھی کہ اصل مقصود مختصراً بیان ہوا اور خیال تھا کہ کسی موقع پر اس کو دوبارہ بیان کردوں گا کیونکہ اول تو حضور ﷺ کے کمالات بیان کرنے کو خود ہی جی چاہتا ہے۔

حقیقت ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ ہم لوگوں پر مخالفین کی ایک نہایت سخت درجہ کی تہمت یہ ہے کہ ہم لوگ حضور ﷺ کا ذکر نہیں کرتے بلکہ غضب یہ ہے کہ وہ لوگ ہم کو ذکر رسول اللہ ﷺ کا منکر اور مخالف کہتے ہیں مگر وہ معترضین دراصل ذکر رسول اللہ ﷺ کی حقیقت نہیں جانتے اس لیے اولاً میں ذکر رسول ﷺ کی حقیقت بتلاتا ہوں، اس کے بعد معلوم ہوجاوے گا کہ یہ تہمت کس درجہ کی ہے جو شخص حقیقت معلوم ہوجانے کے بعد بھی اس بے جا اعتراض سے باز نہ آوے تو اس کا تو ذکر ہی نہیں کیونکہ وہ معاند ہے(۱) جس کا کچھ علاج نہیں۔ باقی اہل فہم وانصاف بخوبی واقف ہوجاویں گے۔ یہ اعتراض محض عناد(۲) کی وجہ سے بدنام کرنے کی غرض سے کیا جاتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ ذکر رسول اللہ ﷺ کی ترکیب یعنی ذکر کی اضافت رسول اللہ ﷺ کی طرف خود صراحتًا بتلا رہی ہے کہ حضور ﷺ کا ذکر آپ کے رسول ہونے کی حیثیت سے کرنا چاہیے۔ جیسا کہ بادشاہ کی سوانح میں دو قسم کے واقعات ہوتے ہیں۔ ایک تو ایسے حالات جو بادشاہی سے تعلق رکھتے ہوں دوسرے وہ حالات جو سب انسانوں کے متعلق ہوتے ہیں۔ مثلاً اس کا تذکرہ کہ فلاں اقلیم (۳) میں فلاں شہر میں فلاں جگہ پیدا ہوا اور پیدائش کے وقت یہ واقعات پیش آئے اور اس کا جسم ایسا تھا، رنگ ایسا تھا یا اس کا طویل القامت وغیرہ ہونا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ باتیں قابل بیان کے نہیں ہیں لیکن اتنا دراز قد ضرور ہے(۴) کہ ان کا بیان فی نفسہ سوانح شاہی کا مقصود نہیں۔ لہٰذا اس قسم کے واقعات کا بیان استطراداً(۵) کیا جاوے گا کیونکہ ''سراپا'' بیان کرنے سے

(۱) وہ ضدی مخالف ہے (۲) بوجہ مخالفت (۳) فلاں بحر الکاہل (۴) اتنا طویل ضروری ہے (۵) ضمناً۔

ظاہری حسن تو معلوم ہوجاوے گا لیکن اس سے اس کا بادشاہ ہونا اور یہ کہ کس درجہ کا بادشاہ تھا ظاہر نہیں ہوتا کیونکہ نفس پیدائش اور حسن وغیرہ بادشاہ ہی کے ساتھ مخصوص نہیں۔ بادشاہی کے لائق تو یہ باتیں ہیں کہ اس نے اس طریق سے انتظام کیا ایسا منصف تھا، بڑا رحم دل تھا، رعایا کی خبر گیری کرتا تھا وغیرہ وغیرہ۔ یہ حالات اصل ہیں سوانح شاہی کے، اگر کسی سوانح میں یہ حالات نہ ہوں تو وہ شاہی سوانح نہیں۔ اس مقام پر میں خواص کو خصوصیت سے متنبہ کرتا ہوں کہ آج کل سوانح عمریاں لکھنے کا لوگوں کو بہت شوق ہوگیا ہے اور جو سوانح عمریاں آج کل لکھی گئی ہیں ان کے سامنے پرانی سوانح عمریاں ہیچ سمجھی جاتی ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ آج کل لوگوں کا مذاق خراب ہوگیا ہے اور اپنے اسی فاسد[1] مذاق کے مطابق انتخاب کرتے اور ترجیح دیتے ہیں۔ چنانچہ سب سے پیشتر تو انتخاب میں شگفتہ کلامی کا لحاظ کیا جاتا ہے۔ اول تو ہم کو یہی تسلیم نہیں کہ متقدمین کا کلام شگفتہ نہیں۔

نئے رنگ کے مصنفین کی تصانیف

دوسرے یہ معیار ہی کیا ہے۔ اصل معیار معنی اور مضامین کی خوبی ہے مگر اس کو اہل فہم ہی سمجھ سکتے ہیں۔ نادان تو فقط الفاظ کو دیکھ کر واہ واہ کرنے لگتے ہیں اسی لئے میں نے خواص کو خطاب میں خصوصیت سے متنبہ کیا ہے کیونکہ وہ فیصلہ کے معیار کو سمجھ سکتے ہیں اور عوام اس معیار کو نہیں سمجھ سکتے اس لیے اگر وہ ایسی سوانح عمری کو جو شگفتہ عبارت میں لکھی گئی ہو پسند کرلیں تو زیادہ تعجب نہیں مگر حیرت یہ ہے کہ خواص بھی آج کل ایسی ہی سوانح عمریوں کی تعریف کرتے ہیں حالانکہ بدون حسن معنوی کے تعریف کرنا اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک تو خمیرہ مروارید ی ہو جو نہایت عمدہ بنا ہوا ہو اور اعلیٰ درجہ کے نفیس نفیس اجزاء رکھتا ہو مگر اس کو سیاہ ڈبہ میں رکھ دیا جاوے اور دوسرا خمیرہ جو بچوں کے بہلانے کے لئے گڑ گھول کر بنالیا ہے اور اس کا بھی خمیرہ نام رکھ دیا ہے سفید اور شفاف بوتل میں رکھ دیا جاوے، تو اب دو قسم کے لوگ ہیں عاقل اور جاہل۔ عاقل تو دونوں کو کھول کر دیکھے گا اور جانچ پڑتال کے بعد خمیرہ مروارید ی کو لے گا اور جاہل جھٹ پٹ چمکتی ہوئی بوتل کو

(۱) بدذوقی کی وجہ سے۔

پسند کرلے گا۔ بس اسی طرح اس نئے رنگ کے مصنفین کی کتابوں میں عبارتیں تو چٹ پٹی ہیں مگر اندر سے خالی ڈھول کہ مضامین خاک بھی نہیں اور متقدمین کی کتابوں میں مغز ہے(۱) روح ہے اس لیے باوجود حال کی سوانح عمریوں کو شگفتہ تسلیم کرلینے کے بھی وہ حقیقت میں قابل ترجیح نہیں اور لفظ پرستوں(۲) کی رائے اس باب میں معتبر نہیں اور نیز یہ بات بھی ہے کہ متقدمین(۳) کی کتابیں پہلے زمانہ میں اس وقت کے محاورہ کے اعتبار سے شگفتہ بھی تھیں جس کو آج کل معیار ترجیح قرار دیا گیا ہے لیکن محاورہ بدل جانے کے باعث اس وقت اس کی شگفتگی میں فرق آگیا ہے اور اس میں ان کی ہی کیا خصوصیت ہے اب سے پچاس سال کے بعد یہ موجودہ سوانح عمریاں بھی شگفتہ نہ رہیں گی اور جس طرح اہل فہم ان کو بوجہ حقیقی خوبی کے مفقود ہونے کے(۴) پسند نہیں کرتے اسی طرح اس وقت ظاہر بینوں کی نظر سے بھی شگفتگی فوت ہوجانے کے سبب سے یہ کتابیں گر جاویں گی کیونکہ آج کل ہر چیز کو ترقی ہے تو زبان کو بھی ترقی ہے ہر سال اس کی شگفتگی میں نیا اضافہ ہوتا ہے۔ بس معلوم ہوگیا کہ عبارت آرائی کوئی حسن نہیں جو اس معیار کو ترجیح قرار دیا جاوے وہ حسن ہی کیا حسن ہے جو کہ اورد ہور(۵) سے بدل جاوے بلکہ اصل چیز معنوی خوبی ہے جس کی شان یہ ہوتی ہے:

خود قوی تر میشود خمر کہن　　خاصہ آں خمرے کہ باشد من لدن(۶)

قدیم ہونا کوئی عیب نہیں

کمالات معنویہ میں مرور دہور سے اور زیادہ قوت اور تاثیر آجاتی ہے وہ جس قدر بھی پرانے ہوں اسی قدر لطافت بڑھتی جاتی ہے کیونکہ روز بروز اس کی خوبیوں پر اطلاع میں ترقی ہوتی رہتی ہے مگر آج کل جدت پسندی کا مذاق ایسا غالب ہوا ہے کہ کسی چیز کا پرانا اور قدیم ہونا ہی اب مستقل عیب شمار کیا جاتا ہے گو اور کوئی عیب بھی نہ ہو لیکن اگر قدیم ہونا ہی عیب ہے تو پھر اس پرانے زمین وآسمان کو چھوڑ دو، کسی نئی زمین پر نئے

(۱) اصل کام کی باتیں (۲) لفظوں کے پجاریوں کی رائے معتبر نہیں (۳) پہلے علماء (۴) نہ ہونے کیوجہ سے (۵) زمانے کے گذر جانے سے بدل جائے (۶) ''پرانی شراب میں خود تیزی بڑھتی جاتی ہے خاص کر وہ شراب جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے عطا ہوئی ہو''۔

آسمان کے نیچے جا کر آباد ہو۔ ہمارے ایک استاد فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ سب سے قدیم ہیں کہ اصلی قدیم وہی ہیں تو جو لوگ جدت کو کمال اور قدیم کو نقص کہتے ہیں ایسے بیہودہ مذاق والوں کو چاہیے کہ (نعوذ باللّٰہ منہ)(۱) اللہ تعالیٰ کو چھوڑ دیں۔ خدا کی پناہ دیکھئے اس جدت پسندی سے کیا نتیجہ لازم آتا ہے بلکہ صحیح نظر سے دیکھا جاوے تو قدیم (۲) ہونا زیادہ مقبول ہونے کا سبب ہے کیونکہ ایک زمانہ تک اس سے انتفاع (۳) کا تجربہ ہو چکا ہے۔ دیکھو آسمان کتنا پرانا ہوگیا ہے مگر اس کی شان یہ ہے کہ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ﴾ (۴) اسی طرح جس مکان میں ابھی تازہ ڈاٹ (۵) لگائی گئی ہو اس میں شروع شروع میں خطرہ ہوتا ہے کہ کہیں ڈاٹ کمزور نہ ہو، اوپر سے نہ آپڑے اور جب عرصہ تک اس کے اوپر آدمی چل پھر لیے ہوں اور زمانہ دراز تک مکان آباد رہ چکا ہو پھر خطرہ نہیں رہتا کیونکہ تجربہ سے اس کا استحکام معلوم ہو چکا ہے اور کوئی عارضی آفت پیش آجائے اور بات ہے، پر قدیم ہونا تو نہایت مستحکم (۶) ہونے کی دلیل ہے اس لئے لازم ہے کہ متقدمین کی کتابوں کو دیکھا جائے اور محاورہ بدل جانے کی طرف بالکل التفات (۷) نہ کریں بلکہ معانی کو دیکھیں۔ گو خود اہل کمال کی کتابوں میں بھی فرق ہوتا ہے کہ معنوی خوبی کے باعث ایک دوسرے پر فوقیت رکھتی ہیں اور اس لحاظ سے اگر باہم اہل کمال کی کتابوں میں ایک کا دوسرے سے مقابلہ کیا جاوے تو مضائقہ نہ تھا مگر جہلاء کی تصنیف سے اہل کمال کی تصنیف کا مقابلہ نہ کرنا چاہیے۔ حیرت ہے افسوس آج کل کس قدر مذاق بگڑ گیا ہے۔

شان ملکیت شان نبوت کے تابع ہے

آج کل جدید سوانح عمریوں کا حاصل صرف یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں شان ملکیت اعلیٰ درجہ کی تھی۔ یعنی آپ بادشاہ اعلیٰ درجہ کے تھے حالانکہ حضور ﷺ کی سوانح وہ ہے جس میں شان رسالت کا بیان ہو اور گو آپ میں دونوں شانیں تھیں،

(۱) میں اس سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتا ہوں (۲) پرانا ہونا (۳) اس سے فائدہ حاصل کرنے کا تجربہ ہو چکا (۴) ''یعنی نگاہ پلٹا کر دیکھو کیا تم کو کچھ سوراخ نظر آتا ہے، پھر بار بار نگاہ کو پلٹو، بالآخر وہ عاجز و درماندہ ہو کر لوٹے گی اور کوئی تم کو نظر نہ آئے گا'' سورۂ ملک: ۴ (۵) نیا نیا لینٹر وغیرہ ڈالا گیا ہو (۶) مضبوط ہونے کی دلیل (۷) توجہ نہ کریں۔

نبوت کی بھی، سلطنت کی بھی مگر شان رسالت صلی اللہ علیہ وسلم اصل ہے اور شان سلطنت تابع اور منصب نبوت کی مُکمِل ہے کیونکہ اصلاح خلق میں جو کہ منصب نبوت ہے لوگوں کے مزاحم (۱) ہونے کی بھی نوبت آجاتی ہے ایسے لوگوں کو زیر کرنے کے لئے سلطنت بھی ضروری ہے۔ پس سلطنت تابع ہوئی مگر یہ لوگ اصل چیز یعنی نبوت کے بیان کو چھوڑ کر سلطنت کے بیان کو لے بیٹھتے ہیں جو کہ تابع ہے، آج کل کی سوانح میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان بادشاہی تو ملے گی مگر کمالات نبوت کے ذکر کے اہتمام سے خالی ملے گی۔ حتی کہ ان سوانح عمریوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام پاک نہ ہو تو دیکھنے سے یہ معلوم نہیں ہوسکتا کہ کس نبی کی سوانح ہے۔ بھلا یہ سوانح سوانح، نبویہ کس طرح کہلانے کی مستحق ہوسکتی ہیں جبکہ اصل کمالات کے ذکر ہی سے عاری ہیں (۲) بلکہ غور کیا جاوے تو یہ سوانح تو تابع کے بیان سے بھی کوری ہیں (۳) کیونکہ درحقیقت حضور ﷺ کی سلطنت کا بیان تو اس کو کہا جاوے گا جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان رسالت کو پوری طرح ملحوظ رکھا گیا ہو جبھی تو وہ سلطنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح ہوگی مگر جب ان میں اس حیثیت کی رعایت نہیں کی گئی تو محض ایک بادشاہ کی بادشاہی کا بیان ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان سلطنت کا تذکرہ نہ ہوا۔

الفاروق علامہ شبلی کے بارے میں

اسی طرح الفاروق وغیرہ کتابیں بھی اصلی معنی میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سوانح نہیں کیونکہ اصل میں خلافت فرع ہے نبوت کی۔ پس یہاں بھی دین اصل اور سلطنت کو تابع ہونا چاہیے لیکن الفاروق وغیرہ جو لکھی گئی ہیں ان کا حاصل یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اتنی فتوحات کیں اس طرح لشکر کا، ملک کا انتظام کیا جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر ان حضرات کے ہاتھ سے یہ امور سرانجام نہ ہوتے تو وہ حضرات صاحب کمال کہلانے کے مستحق نہ تھے حالانکہ شجاعت وانتظام وفتوحات ملکی وغیرہ حضرات خلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے اصلی کمالات نہیں تھے۔

(۱) لوگوں سے ٹکراؤ (۲) خالی ہیں (۳) عاری ہیں۔

حضرات خلفائے راشدینؓ کے اصل کمالات

اصل کمال وہ ہے جس کی بناء پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: ''لو کان بعدی نبیا لکان عمرؓ ''(۱) اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمر ہوتے۔ اصل کمال وہ ہے جس کے باعث فرمایا: ''ابوبکر فی الجنة وعمر فی الجنة ''(۲) ابوبکرؓ جنت میں ہیں اور عمرؓ جنت میں ہیں۔ اور یہ کمالات ان حضرات میں خلافت سے پہلے موجود تھے۔ خلیفہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہوئے۔ غرض اصل کمال آنحضرت ﷺ کا شان نبوت ہے۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر جو مقصود اصلی ہے وہ ہے جو من حیث الرسول (رسول ہونے کے اعتبار سے) ہو۔ البتہ چونکہ محبوب کا ہر ذکر محبوب ہوتا ہے اس لئے آپ کے تمام حالات وکمالات کا ذکر بھی محبوب ہے مگر درجہ بدرجہ مثلاً رضاع ولادت وشق صدر(۳) وغیرہ واقعات کا ذکر بھی فی نفسہ محبوب ہے۔ لیکن عطائے نبوت ونزول قرآن وغیرہ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اُمت کی جو اصلاح فرمائی ہے ان امور کا بیان زیادہ اہم اور زیادہ محبوب ہے۔ کیونکہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت شریفہ سے بھی اصل مقصود یہی ہے۔ پس جب ہم ان ذکروں کو برابر کرتے ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اصل شان کے مناسب ہیں تو پھر ہم کو ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خالی کس طرح کہا جاتا ہے بلکہ اس سے بڑھ کر غضب یہ کہ ہم کو منکر ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہا جاتا ہے۔ (استغفر اللہ)

چوں ندید ند حقیقت رہ افسانہ زدند(۴)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اصلی شان

حقیقت میں ان لوگوں نے ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقت ہی کو نہیں سمجھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اصلی شان اصلاح ہے ان معاملات کی جو حق تعالیٰ اور اس کے بندوں میں ہیں۔ اور ہم لوگ ان ہی کی توفیق سے رات دن قرآن وحدیث وفقہ

(۱) سنن الترمذی: ۳۶۸۶، مشکوٰۃ المصابیح: ۶۰۳۵ (۲) سنن ابی داؤد: ۴۶۵۰، سنن الترمذی: ۳۷۴۷ (۳) مثلاً آپ کے دودھ پلائی پیدائش اور سینہ چاک کئے جانے کا تذکرہ (۴) ''جب حقیقت کا پتہ نہ چلا، ڈھکوسلوں پر اُتر آئے''۔

کے چرچے میں رہتے ہیں، جن میں اسی شان کا زیادہ ذکر ہے۔ اور ہم ان ہی احکام کا تذکرہ کرتے ہیں۔ یہ سب ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی تو ہے گو اس میں کبھی آپ کا نام مبارک بھی زبان پر نہ آوے کیونکہ ذکر کے واسطے نام لینا ضروری نہیں ہے بلکہ بعض اوقات اس نام نہ لینے میں بھی ایک خاص شان ظاہر ہوتی ہے۔ جیسا کہ قرآن شریف کی بابت حق تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ﴾ ''کہ ہم نے اس کو شب قدر میں نازل کیا ہے'' یہاں قرآن کا نام نہیں لیا اور وجہ اس کی یہ ہے کہ جب بدون نام لیے ادھر ہی ذہن جاتا ہے تو معلوم ہوا کہ اس کی بہت بڑی شان ہے۔ چنانچہ جب قبر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت مردہ سے سوال ہوگا کہ (ما کنت تقول فی هذا الرجل .رواه البخاری) ''اس مرد کے بارے میں کیا کہتا ہے اس کو بخاری نے روایت کیا ہے'' تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نہ لیا جاوے گا بلکہ اس طرح دریافت کریں گے کہ یہ شخص کون ہیں مسلمان جواب دے گا کہ'' هو عبدالله ورسول الله '' (وہ اللہ کے بندے اور اللہ کے رسول ہیں) (صلی اللہ علیہ وسلم)۔ دیکھئے ''فی هذا الرجل '' (یہ شخص) کہنے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ذہن چلا جاوے گا اور بعض روایات میں جو اس کے ساتھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم آیا ہے وہ راوی کا قول ہے بیان کے لیے شراح نے اس کی تصریح کی ہے کہ یہ لام بیانیہ ہے۔ غرض ذکر صرف نام لینے ہی کو نہیں کہتے بلکہ بدون نام کے بھی ذکر ہوتا ہے۔ ہاں اس کا پتہ ہر شخص کو نہیں چلتا بلکہ اس کا پتہ عاشق کو لگتا ہے وہ خوب پہچانتا ہے۔ یہ عاشق ہی کی شان ہوتی ہے کہ اس کے علم کے لیے ہر وقت محبوب کا نام لینے کی بھی ضرورت نہیں کیونکہ وہ ہر طرح پہچان لیتا ہے۔ کیا خوب کہا ہے:

ہرچہ بینم در جہاں غیر تو نیست　　یا توئی یا خوئے تو یا بوئے تو(۱)

اسی کو عارف جامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

بس کہ جان فگار وچشم بیدارم توئی　　ہرچہ پیدا میشود از دور پندارم توئی(۲)

اور کسی نے اس مضمون کو اردو میں کہا ہے:

(۱) ''کہ ہر چیز کی طرف نظر کر کے دیکھا تو آپ ہی کی طرف نظر پہنچتی ہے'' (۲) میری جان فگار اور چشم بیدار میں تو ہی بسا ہوا ہے جو کچھ دور سے ظاہر ہوتا ہے تجھ ہی کو گمان کرتا ہوں''۔

جب کوئی بولا صدا کانوں میں آئی آپ کی

کسی منکر نے حضرت عارف جامی رحمۃ اللہ علیہ پر جب وہ ایک خاص حالت میں اس شعر کا تکرار فرما رہے تھے بطور اعتراض کے کہا کہ اگر خریدا شود فوراً اس کی طرف اشارہ کر کے جواب دیا: پندارم توئی۔

ایک شعر کسی صاحب حال کا ہے:

گلستان میں جا کر ہر اِک گل کو دیکھا　　نہ تیری سی رنگت نہ تیری سی بُو ہے

کسی عاشق نے اس کو اس طرح بدلا:

گلستان میں جا کر ہر اِک گل کو دیکھا　　تیری ہی سی رنگت تیری ہی سی بُو ہے

یہ بھی وہی مضمون ہے:

ہرچہ بینم در جہاں غیر تو نیست　　یا توئی یا خوئے تو یا بوئے تو(۱)

ذکر کی دو قسمیں

خلاصہ یہ ہے کہ نصوص فضائل میں تو آپ کا ذکر ہے بیع وشرا(۲) کی آیات واحادیث ومسائل میں بھی آپ کا ذکر ہے کیونکہ ان سب کا تعلق وحی سے ہے اور وحی کا تعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے اور وحی کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کو یقیناً مستلزم ہے(۳) گو صراحۃً نہ ہو اور یہ استلزام ایسا ہے جیسا کسی نے امام محمد سے کہا تصوف میں آپ کی کوئی تصنیف نہیں۔ امام محمد کی نوسو ننانوے تصنیفات ہیں، ہزار میں ایک ہی کی کسر رہ گئی مگر مستقل طور پر معروف طریق سے تصوف میں کوئی تصنیف نہیں۔ اس سوال پر آپ نے فرمایا کہ جامع صغیر تصوف ہی تو ہے اس پر سوال کیا گیا کہ اس میں تو بیع وشرا(۴) وغیرہ معاملات کے مسائل ہیں۔ ارشاد فرمایا کہ جب یہ معاملات درست نہ ہوں گے نفس میں وہ چیزیں پیدا ہوں گی جو تصوف میں مقصود ہیں۔ دیکھئے ان معاملات کو تصوف کہا گیا بوجہ استلزام کے، احکام شرعیہ کا تذکرہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ کیوں

(۱) ''تمام عالم آپ کی صفات کا مظہر ہے ہر چیز کو آپ سے تعلق ہے، غیر کا وجود ہی نہیں بلکہ ہر جگہ آپ کا ظہور ہے'' (۲) خرید وفروخت سے متعلق آیات احکام میں بھی (۳) وحی کے ذکر کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر آنا لازمی ہے (۴) خرید وفروخت۔

نہ کہلائے گا اور مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ تو اس سے بڑھ کر فرماتے ہیں کہ ذکر کی دو قسمیں ہیں ایک زبان سے ایک بغیر زبان کے یعنی حال سے، فرماتے ہیں:

گرچہ تفسیر زباں روشن تراست لیک عشق بے زباں روشن است(۱)

جب خاموشی بھی دال ہے عشق پر تو نطق(۲) کیوں نہ دال ہوگا مگر آج کل لوگوں نے ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خاص طریقہ کے نطق(۳) میں منحصر کر رکھا ہے جس کی کوئی دلیل نہیں۔

ہمیشہ ذکر میلاد

مولانا فضل الرحمٰن صاحب سے کسی نے دریافت کیا کہ آپ ذکر میلاد نہیں کرتے۔ آپ نے فرمایا کہ ہم تو ہمیشہ ذکر میلاد کرتے ہیں پھر کلمہ شریف پڑھ دیا اور فرمایا اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیدا نہ ہوتے تو آپ کا کلمہ کون پڑھتا۔ یہ لوگ حقیقت شناس ہیں مگر لوگ بے سوچے سمجھے اعتراض کر بیٹھتے ہیں اس نے پھر کہا کہ بلا واسطہ بھی تو ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہونا چاہیے، فرمایا لو وہ بھی ابھی کرتے ہیں اور یہ شعر پڑھ دیا:

تر ہوئی باران سے سوکھی زمیں یعنی آئے رحمۃ للعالمین ﷺ

مطلب یہ کہ مولانا نے بلا قید رسوم کے ذکر کر کے دکھلا دیا۔ غرض ذکر رسول ﷺ کی جو حقیقت ہے ہم الحمدللہ اس سے کسی وقت بھی خالی نہیں اور کبھی کبھی بلا واسطہ بھی رسوم ومنکرات سے احتراز کر کے ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کر لیتے ہیں کیونکہ یہ بھی اعظم مستحبات سے ہے(۴) یہ گفتگو تو ان لوگوں سے تھی جو ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں غلو سے کام لیتے ہیں۔ اگر کوئی شخص مطلقاً اس ذکر کا انکار کرے، گو منکرات سے خالی بھی ہو تو اس سے مولانا فضل الرحمٰن صاحب کی طرح محاجہ(۵) کیا جاوے گا۔

حکمت ذکر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

اس کا بھی واقعہ ہے کسی نے آپ سے کہا کہ ہم نے مانا کہ ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

(۱) ''اگرچہ زبان کا بیان روشن تر ہے لیکن عشق بے زبان زیادہ روشن ہے کیونکہ وہ امور ذوقیہ ہے جس کو زبان سے اچھی طرح نہیں کیا جاسکتا'' (۲) جب خاموشی عشق پر دلالت کر رہی ہے تو گویائی کیوں دلالت نہ کرے گی (۳) گفتگو (۴) آپ کا ذکر تمام مستحب کاموں میں سب سے افضل ہے (۵) دلیل دی جائے گی۔

اچھا ہے مگر اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔ آپ نے فرمایا جی ہاں نہ معلوم اللہ تعالیٰ کو مریم وابن مریم علیہما السلام کے ذکر کی کیا ضرورت تھی اور موسیٰ علیہ السلام وابراہیم علیہ السلام کے ذکر کی کیا ضرورت تھی کہ قرآن شریف میں جابجا نہایت تاکید وتکرار سے آیا ہے، ارشاد ہے: وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ (۱) وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوْسٰٓى (۲) وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ ابراهيم (۳) (اور اس کتاب میں مریم علیہا السلام کا ذکر کیجئے اور اس کتاب میں موسیٰ علیہ السلام کا ذکر کیجئے اور اس کتاب میں ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کیجئے) کہ خود بھی ذکر فرماتے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ذکر کا امر (۴) فرماتے ہیں۔ بتلاؤ اس کی کیا ضرورت تھی۔ بزرگوں کے کلام میں حکمتیں ہوتی ہیں اس کے یہ معنی ہیں کہ جس طرح مصلحت کی وجہ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام وابراہیم علیہ السلام کا ذکر قرآن شریف میں آیا ہے اسی طرح بعض مصالح کی وجہ سے ہم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر شریف کی بھی ضرورت ہے اور اس میں ایک مصلحت تو یہ ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پیدا ہونا، بچہ ہونا، بڑھنا وغیرہ معلوم ہوگا تو اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر الوہیت (۵) کا احتمال ووسوسہ پیدا نہ ہوگا۔ یہی مصلحت قرآن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تولد (۶) کے ذکر میں بھی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اپنی ماں کے پیٹ سے اس طرح پیدا ہوئے تو ان کی الوہیت (۷) کا دعویٰ جو نصاریٰ کرتے ہیں وہ کیسے صحیح ہوسکتا ہے اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کا بھی ذکر کرو تو ان حکمتوں کی وجہ سے کرو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے، دودھ پیا، پھر بڑے ہوئے، کھاتے پیتے بھی تھے اور وفات بھی پائی۔ یہ سب حالات بتلا رہے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم الٰہ نہیں (۸) بلکہ بشر (۹) ہیں۔ بس ان حالات ولادت وغیرہ کے ذکر کے ساتھ اس سے نتائج نکالے جاویں۔ اس بناء پر اس کا مرجع بھی وہی شان نبوت ہوئی کیونکہ اصلاح عقیدہ (۱۰) کا تعلق منصب نبوت سے ہے۔ پس ایک مصلحت تو یہ ہے اور دوسری مصلحت عشاق کی ہے وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت بڑھے کیونکہ کمالات کے بیان

(۱) سورۂ مریم: ۱۶/۱۹ (۲) سورۂ مریم: ۱۵/۱۹ (۳) سورۂ مریم: ۴۱/۱۹ (۴) حکم دیتے ہیں (۵) معبود ہونے کا وسوسہ نہیں آئے گا (۶) پیدائش (۷) خدائی کا دعویٰ (۸) معبود نہیں (۹) انسان (۱۰) عقیدہ کی درستگی۔

سے محبت بڑھتی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں بچپن ہی سے عجیب عجیب کمالات تھے۔ چنانچہ آپ ایک چھاتی کا دودھ پیتے تھے اور دوسری کا اپنے رضاعی بھائی کے واسطے چھوڑ دیتے اس کو منہ نہ لگاتے تھے۔ اسی طرح ہر واقعہ میں ایک کمال ظاہر ہوتا ہے۔ غرض ان واقعات سے محبت میں اضافہ ہوتا ہے اور محبت کی غرض اتباع ہے اس لیے اس کا مرجع بھی پھر وہی نبوت ہوا اور بدون اتباع کے نری محبت من حیث الذات نہ مطلوب نہ نافع (۱)۔ سب کو معلوم ہے کہ حضرت ابوطالب کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کتنی محبت تھی اور گو ان کا ایمان دلائل سے ثابت نہیں مگر جب ان کا نام آتا ہے تو نام کے ساتھ حضرت کا لفظ منہ سے نکل ہی جاتا ہے کیونکہ وہ تو جاں نثار خادم تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اور ہم تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جانوروں کی بھی تعظیم کرتے ہیں وہ تو چچا ہیں اللہ معاف کرے اگر ان کو حضرت کہنے میں کوئی خرابی ہو۔ بہرحال جتنی محبت ان کو تھی اتنی محبت شاید بعض مسلمانوں میں بھی مشکل سے پائی جاتی ہو کیونکہ آج کل اکثر ہم لوگوں کی یہ حالت ہے:

تو بیک زخمے گریزانی زعشق تو بجز نامے چہ میدانی زعشق (۲)

گو ہم مومن ہیں لیکن ذرا سا امتحان آتا ہے تو نکل بھاگتے ہیں اور انہوں نے تو بڑے بڑے شدائد میں (۳) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیا اور تکلیفیں اٹھائیں۔

حقوق العباد کی اہمیت

ہم لوگوں کے نکل بھاگنے کے متعلق ابھی کا تازہ واقعہ ہے جس کا قلق ساری عمر دل سے نہ اُترے گا کہ ایک شخص بیمار تھے، بیماری میں کبھی وہ خود مجھ کو بلاتے تھے کبھی میں خود جاتا تھا کیونکہ ان سے محبت تھی اور وہی محبت مقتضیٰ ہوئی کہ جن حقوق العباد میں (۴) وہ مبتلا ہیں۔ ان سے ان کو نکالا جاوے اس لیے اول تو خود تحریراً کہا کیونکہ مجھ کو بالمواجہ (۵) نصیحت کرتے ہوئے شرم آتی تھی اور وجہ اس کی یہ ہے کہ مخاطب کو اس سے طبعاً شرم آتی

(۱) آپ کی ذات سے صرف انسان ہونے کی بنا پر محض نفس محبت کا پایا جانا نہ مطلوب ہے نہ اسکا فائدہ ہے۔ اصل مقصود اتباع نبی ہے (۲) ''تو ایک ہی زخم سے عشق سے گریز کرتا ہے بجز نام کے عشق کی حقیقت سے ناواقف ہے'' (۳) مشکل وقت میں (۴) ان صاحب کے ذمہ بہت سے لوگوں کے حقوق تھے جن کی ادائیگی حضرت کرانا چاہتے تھے اس کے بارے میں بات ارشاد فرمائی (۵) منہ در منہ نصیحت کرتے ہوئے شرم محسوس ہوئی۔

ہے اس کی شرم کے خیال سے مجھ کو بھی شرم آجاتی ہے۔ جیسا کہ صائب نے کہا ہے کہ بندش عجیب ہوتی ہے کسی نے امتحاناً ایک مصرعہ دیا کہ اس پر بند لگادو(۱)۔ مصرعہ یہ تھا:

بے زری کرد بمن انچہ بقاروں زر کرد

یعنی زرداری اور مالداری نے جو قارون کے ساتھ کیا تھا وہ میرے ساتھ بے زری اور فقیری نے کیا، واقعی بہت سخت بندش تھی کیونکہ زرداری تو قارون کے لیے سبب خسف (۲) ہوئی۔ اس وجہ سے کہ اس نے زکوٰۃ سے انکار کردیا تھا مگر بے زری وجہ خسف (۳) کیونکر ہوسکتی ہے کیونکہ بندش بہت دشوار تھی اس واسطے کسی صائب کے پاس پیش کیا کیونکہ وہ اس فن میں کامل تھا اس نے اس پر نہایت ہی عمدہ مصرعہ لگادیا:

صائبا خجلت سائل بزمینم در کرد بے زری کرد بمن آنچہ بقاروں زر کرد

یعنی ایک شریف سائل نے مجبوری میں مجھ سے سوال کیا اور میرے پاس کچھ دینے کو نہ تھا اس لیے جواب دیدیا جس سے وہ شرمندہ ہوا کہ مانگ کر ذلت بھی اٹھائی اور کام بھی نہ بنا تو اس کی شرمندگی سے میں شرمندہ ہوکر زمین میں دھنس گیا، بینظیر مصرعہ ہے۔

غرض مجھ کو بھی بعض دفعہ مخاطب کی خجلت بالمواجہ سامنے شرمندہ ہونا خطاب کرنے سے مانع ہوجاتی ہے اور یہ حالت دواماً نہیں ہوتی بلکہ اختلاف احوال کی وجہ سے طبیعت کا رنگ مختلف ہوتا ہے کسی وقت تو مجھ پر یہ اثر ہوتا ہے اور کسی وقت کوئی خاص اثر غالب ہوتا ہے تو اس وقت بالمواجہ (۴) بھی نصیحت کرنا پڑتی ہے۔

بہرحال اس موقع پر اثر مانع ہی غالب تھا اس لیے میں نے تحریراً نصیحت کی اور رقعہ (۵) بھیج دیا پھر احتمال ہوا کہ شاید پڑھا نہ ہو اس لیے اپنے ایک معتمد کو بھیجا کہ جاکر وہ رقعہ پڑھ دو، انہوں نے جاکر رقعہ پڑھا تو جواب یہ ملا کہ یہ تو سچ مگر اہل وعیال کے لیے کیا چھوڑوں، اس معتمد نے کہا کہ یہ حقوق العباد ہیں ان کا کیا ہوگا، جواب دیا کہ خدا تعالیٰ معاف کردے گا۔ اس پر اس معتمد نے کہا کہ حقوق العبد کے معاف کرنے کا وعدہ نہیں ہے بلکہ مواخذہ کی وعید آئی ہے پھر کیسے اطمینان معافی کا ہوسکتا ہے۔ جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ

(۱) دوسرا مصرع لگاؤ (۲) مال دار ہونا تو قارون کے لیے زمین میں دھنسائے جانے کا سبب ہوا (۳) مال کا نہ ہونا زمین میں دھنسائے جانے کا سبب کیسے ہوسکتا ہے (۴) منہ پر ہی نصیحت کرنی پڑتی ہے (۵) خط۔

اہل حقوق سے معاف کرادیں گے اس پر جلسہ ختم ہوا۔ (جامع کہتا ہے کہ ان معتمد نے مجھ سے یہ بھی بیان کیا تھا کہ حضرت والا نے ارشاد فرمایا تھا کہ واپسی حقوق کے لیے جس خرچ کی ضرورت ہو کیونکہ وہ حقوق موروثی زمین تھی اس سے استعفاء دینے میں کچھ خرچ ہوتا ہے، بشرط ضرورت میں وہ بھی دے دوں گا۔ اس سے اس شخص کے ساتھ محبت کا اندازہ ہوتا ہے۔ کیوں صاحبو! کیا خدا کا یہی ڈر ہے کہ یقینی معلوم ہے کہ مرنے والا ہوں مگر اہل وعیال کے لیے جائیداد چھوڑنے کی فکر اور وہ بھی غیروں کے حقوق سے، دل سے نہیں نکلی اور عین اس حالت میں بھی خدا کا حکم سن کر خوف خدا نہ آیا اور میں رحمت کے بھروسہ پر معافی کی امید سے منع نہیں کرتا مگر سوال یہ ہے کہ بلا عذاب کے معافی کی کیا دلیل ہے اور اگر معاف ہوا بھی تو قیامت میں ارضاء خصم (۱) کے بعد ہوگا۔ برزخ میں تو محبوس اور معذب ہی رہے گا (۲)، آخر ان کا انتقال ہوگیا اور مجھ سے جنازہ کی نماز پڑھوائی گئی۔ مروت کی وجہ سے پڑھ تو دی مگر نماز پڑھنا مشکل ہوگیا۔ اگر حضور ﷺ اس عالم میں تشریف رکھتے تو اس شخص کی نماز ہرگز نہ پڑھتے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ جس میت کے ذمہ قرض ہوتا اس کے بارے میں صحابہؓ سے فرمادیتے ''صلوا علی صاحبکم ''یعنی اپنے ساتھی کی نماز تم ہی پڑھ لو۔ اس لیے دل تو نہ چاہتا تھا مگر زندوں کی خاطر سے نماز پڑھائی لیکن کیا عرض کروں باوجودیکہ مجھ کو عموماً ہر مؤمن کے واسطے جانب رجاء (۳) ومغفرت غالب ہوتی ہے مگر اس کے متعلق غالب گمان عذاب کا ہوتا تھا۔

ایک پاجی کی حکایت

اور مرتے ہوئے جو اس شخص نے رجاء عفو ومغفرت کا اظہار کیا ہے یہ رجاء ایسی تھی جیسے ایک شرابی کی حکایت ہے کہ اس نے عین نزع کی حالت میں شراب پی کر کہا تھا کہ لوگ مجھ کو عذاب سے ڈراتے ہیں مگر مجھ کو تیری ذات سے اتنی امید ہے کہ شراب پی کر مرتا ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ تو معاف کردے گا۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ وہ شخص رجاء اور امید کا اعلیٰ درجہ رکھتا تھا مگر دراصل وہ راجی نہ تھا بلکہ پاجی تھا (۴)۔ شیطان نے

(۱) دشمن کو راضی کرنے کے بعد ہوگا (۲) عالم برزخ میں تو گرفتار اور عذاب ہی میں رہے گا (۳) مغفرت کی امید (۴) اللہ سے بخشش کا امیدوار نہیں بلکہ احمق تھا۔

غلبہ رجاء کے پردہ میں جرأت اور گستاخی سکھا کر اس کی راہ ماردی(۱)۔ اللہ تعالیٰ سب آفات اور ہر قسم کے شیطانی ونفسانی دھوکوں سے محفوظ رکھے۔ (آمین ثم آمین) رجاء تو حسب تصریح اکابر اس کو کہتے ہیں کہ جس طرح کسان کھیت میں دانہ ڈال کر اُمید کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو بار آور کرے گا اور خود ہی برابر ہر قسم کی خدمت کرتا رہتا ہے، کچھ تو کرو جس کی بناء پر امید کرتے ہو۔ اگر حتی المقدور کوشش کی اور پھر بھی نہ ہوسکا یا کچھ کوتاہی ہوگئی تو امید عفو ہے(۲) جیسا کہ باوجود عزم کے فوت شدہ نمازوں کی قضا کا وقت نہ ملا تو استغفار واعتذار معافی کی امید ہوسکتی ہے(۳) غضب تو یہ ہے کہ ظالم کو وقت ملا اور نیت تک بھی نہ کی۔ جب میں اس شخص کے جوابوں کا جس سے اس کی کمال جرأت ثابت ہوتی ہے تصور کرتا ہوں تو مجھے سخت وحشت ہوتی ہے کسی طرح نہیں گواہی دیتا کہ بدون مواخذہ اس کی مغفرت ہوگئی ہو۔ ''الامر بید اللّٰہ'' (معاملہ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے)۔ بس دیکھ لیا آپ نے کہ چار بیگھہ زمین کے واسطے سارا عشق ختم ہوگیا۔ یہ محبت کس کام کی کہ زبانی باتیں بنانے کو سب سے آگے مگر اتباع سے جان چراتے ہیں، ان کا کیا منہ ہے کہ اپنے کو محبین میں شمار کریں یہ تو مدعیان محبت کی حالت کا بیان تھا جو صرف بیان سوانح نبویہ کو ادائے حق محبت کے لیے کافی سمجھتے ہیں اور اتباع کے نام سے صفر(۴)۔

نجات کے لیے خالی محبت کافی نہیں

اسی طرح ایک درجہ میں ایسے لوگ بھی خطا پر ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوری طرح محبت نہیں کرتے، نری ضابطہ کے اتباع کو کافی سمجھتے ہیں مگر دونوں میں فرق یہ ہے کہ یہ اہل اتباع ناجی تو ہیں اور جو اتباع نہ کرے ویسے ہی محبت کا دم بھرے وہ ناجی بھی نہیں یعنی جتنی کمی اتباع میں ہے اتنی ہی کمی نجات میں۔ جیسا کہ ابوطالب کی بابت سب کو معلوم ہے کہ کس قدر جاں نثار تھے۔ جب تمام قریش نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مقاطعت کی، یا آج کل کی اصطلاح میں بائیکاٹ کیا، آج کل کے بائیکاٹ کو تو جو اس وقت ملک میں پھیل رہا ہے میں بھائیکاٹ کہا کرتا ہوں کیونکہ وہ ''رحماء علی الکفار اشداء بینھم''(۵)

(۱) اس کو بھٹکایا (۲) معافی کی امید (۳) فوت شدہ نمازوں کی قضاء کرنے کا پختہ ارادہ ہونے کے بعد مرض کی وجہ سے مہلت نہ ملی تو عذر سنکر معافی کی امید ہوسکتی ہے (۴) اتباع احکام نبوی بالکل نہیں کرتے (۵) ''کافروں پر رحم دل ہیں آپس میں سنگدل''۔

کا مصداق ہوتا ہے یعنی اسکی حقیقت یہ ہے کہ غیروں سے تو اتحاد کرو اور اپنے بھائیوں سے بغض وفساد کرو۔ قریش کے بائیکاٹ کا قصہ یہ ہوا تھا کہ قریش نے اتفاق کرلیا اور خانہ کعبہ پر عہد نامہ لٹکا دیا تھا جس پر عمائد (۱) کے دستخط تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کا ساتھ دینے والوں کے ساتھ کوئی معاملہ، بیاہ، شادی یا بیع وشرا کا نہ کیا جاوے اس موقع پر ابوطالب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیا، قریش کی کچھ پرواہ نہ کی وہ ایمان تو نہ لائے مگر ساتھ دیا پورا، گو سخت پریشانی ہوئی مگر جاں نثاری میں مستقل رہے۔ ایک روز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے چچا وہ عہد نامہ دیمک نے کھالیا، سوا اللہ کے نام کے اس میں کچھ نہیں رہا۔ ابوطالب نے قریش سے کہا میرا بھتیجا ایک خبر دیتا ہے وہ سن لو اور واقعہ کی تصدیق، تحقیق کرلو، سو اگر وہ صحیح نکلے تو کم از کم مقاطعت (۲) موقوف کردو۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بیان کیا۔

جب قریش نے اس عہد نامہ کو دیکھا تو واقعی دیمک نے کھالیا تھا اس پر مقاطعت ختم ہوگئی۔ دیکھئے ابوطالب کو کتنی محبت تھی، بھلا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اتنا ساتھ فی ہزار ایک مسلمان تو دے دے۔ بات یہ تھی کہ ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے خاص عشق تھا اور بے انتہا محبت تھی مگر باوجود اس کے ایمان نہیں لائے اور اتباع نہیں کیا اس لیے نجات کے لیے وہ محبت کافی نہ ہوئی۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ ابوطالب کو سب سے زیادہ ہلکا عذاب ہوگا جس کی کیفیت یہ ہوگی کہ پاؤں میں آگ کی جوتیاں پہنائی جاویں گی اس کے باعث سر کھولتا ہوگا۔ ''او کماقال'' اور وہ یہ سمجھتے ہوں گے کہ سب سے زیادہ میں ہی عذاب میں ہوں۔ خیالی انتفاع (۳) بھی نہ ہوگا کیونکہ یہ معلوم کرکے بھی کہ مجھ کو اوروں سے کم عذاب ہے، عذاب کے الم (۴) میں تخفیف ہوجاتی ہے مگر وہاں تو سب دوزخی یہی سمجھیں گے کہ ہم سب سے زیادہ تکلیف میں ہیں، تکلیف وراحت میں خیال کو بڑا دخل ہے۔ اگر کسی کی ہزار روپیہ تنخواہ ہو اور دوسرے کی دو ہزار تنخواہ سن لے تو خوشی میں کمی آجاتی ہے اسی طرح اگر یہ سن لے کہ مجھ سے زیادہ کسی کی تنخواہ نہیں تو خوشی بڑھ جاتی ہے۔ گو اس کی تنخواہ ہزار روپیہ سے بھی کم ہو

(۱) سرداروں کے (۲) بائی کاٹ ختم کردو (۳) وہمی فائدہ بھی نہیں ہوگا (۴) درد میں کمی ہوجاتی ہے۔

مگر وہاں ہر جنتی و دوزخی یہی سمجھے گا کہ سب سے زیادہ راحت یا عذاب مجھ ہی کو ہے۔

اعتراض کا جواب

ایک معقولی صاحب نے درس حدیث میں اس پر کہا کہ کیا جنت میں جہل مرکب ہوگا کہ اپنے کو سب سے بڑا سمجھا کہ حالانکہ ہے بہتوں سے کم مگر واقع میں وہاں جہل نہ ہوگا، نہ مرکب، نہ بسیط بلکہ سب کو صحیح انکشاف ہوگا۔ جہل مرکب تو جب لازم آئے کہ یوں نہ سمجھے کہ میں درجہ میں سب سے بڑا ہوں باقی اپنے کو سب سے زیادہ راحت میں سمجھنا اس اعتقاد کو مستلزم نہیں کیونکہ یہ بھی تو ممکن ہے کہ اپنے کو دوسروں سے درجہ میں کم سمجھے اور راحت میں زیادہ سمجھے۔

جنت میں ہر شخص کے مذاق واستعداد کے مطابق سامان دیا جائیگا

کیونکہ ہر شخص کو عیش اس کی حیثیت اور طبیعت واستعداد کے مناسب ہوتا ہے، کسی کو ادنیٰ ہی چیز سے رغبت ہوتی ہے اعلیٰ سے نہیں ہوتی گو یہ بھی جانتا ہے کہ یہ ادنیٰ ہے یہ اعلیٰ ہے مثلاً مجھ جیسے مذاق والے کو دال مرغوب ہے بہ نسبت قورمہ کے گو قورمہ کو اعتقاداً سب سے اعلیٰ جانتا ہوں مگر بوجہ اپنے مذاق خاص کے دال سے رغبت زیادہ ہے کیونکہ ہماری طبیعت کے موافق وہی ہے یہ تھوڑا ہی ہے کہ ہمیں قورمہ کی حقیقت معلوم نہیں۔ بس اسی طرح جنت میں ہر شخص کو اس کے مذاق واستعداد کے موافق سامان دیا جاوے گا۔ ادنیٰ درجہ والوں کا مذاق بھی ادنیٰ ہوگا ان کو اس مذاق کی وجہ سے رغبت ہی ادنیٰ سامان کی طرف ہوگی۔ اس سے اعلیٰ کی طرف رغبت ہی نہ ہوگی۔ گو اس کے اعلیٰ ہونے کا علم بھی ہوگا۔ اس طرح سے جنت میں ہر شخص اپنے کو سب سے زیادہ راحت میں سمجھے گا بلکہ ترقی کر کے کہتا ہوں کہ عجب نہیں جو لوگ جہنم سے نکل کر جنت میں جائیں گے ان کو جنت میں جانے کے بعد خود عذاب جہنم بھی شرط راحت معلوم ہو۔ وجہ یہ کہ اوپر معلوم ہو چکا کہ راحت کی شرط مذاق واستعداد خاص ہے تو ممکن ہے کہ یہ معذب گناہوں کے سبب ایسا فاسدالاستعداد ہو گیا ہو کہ جو راحت اس کو اب جنت میں عطا ہوئی ہے اس کی استعداد اس شخص میں نہ رہی ہو اور عذاب اسی فساد

استعداد سے تطہیر کا(۱) موجب ہوکر یہ شخص کامل الاستعداد ہوگیا ہو اور اس کو وہی استعداد عطا ہوگئی ہو جو شرط تھی اس راحت کے ادراک اور انتفاع کی۔

کبھی سزا شرط راحت ہوتی ہے

خوب سمجھ لو عجیب تحقیق ہے اس کی مثال میں مجھے ایک حکایت یاد آئی۔ ایک انگریز کے سائیس(۲) نے لاٹری میں ایک چٹھی ڈالی تھی، دو لاکھ روپیہ کے لیے یعنی ایک ایک روپیہ دو لاکھ آدمیوں نے جمع کیا کہ جس کا نام نکل آوے سب رقم اس کو مل جاوے گی اس میں یہ سائیس بھی شامل ہوگیا۔ آج کل اس قسم کے معاملات بکثرت پھیلے ہوئے ہیں اور حرام وحلال کی کچھ پرواہ نہیں کی جاتی یہ صریح جوا ہے۔ القصہ اس کا نام نکل آیا اس انگریز کی معرفت خط آیا جس کا وہ نوکر تھا اس نے کھولا تو دیکھا دو لاکھ روپیہ کی چٹھی سائیس کے نام ہے اس کو بلا کر پوچھا کہ تو نے لاٹری میں چٹھی ڈالی ہے اس نے کہا جی ہاں، پوچھا کہ بدون ہماری اجازت کے کیوں ڈالی اس نے جواب دیا کہ اس میں تو آپ کی اجازت کی ضرورت نہ تھی، قانوناً مجھ کو اجازت ہے۔ انگریز نے کہا کیسا قانون اور بید(۳) لے کر اس کو خوب مارا اور توبہ کرائی کہ پھر کبھی چٹھی نہ ڈالے۔ بیچارہ جب زخمی ہوگیا اور سخت پریشان ہوا کہ یہ ناگہانی آفت کہاں سے آپڑی اس وقت انگریز نے کہا کہ لو تمہارے نام دو لاکھ روپے نکل آئے ہیں اور کہا کہ اگر پہلے ہی یکدم تم کو یہ خط سنایا جاتا تو تم خوشی سے مرجاتے اس لیے تم کو یہ تکلیف دی گئی۔ اس وقت اس سائیس کو یہ سزا بھی موجب مسرت معلوم ہوئی ہوگی وہ انگریز کو دعا دیتا ہوگا کہ اچھا ہوا اس نے دفعتاً مجھے دو لاکھ کی خبر نہ سنائی۔ تو آپ نے دیکھا کہ دنیا میں بھی سزا کبھی شرط راحت ہوتی ہے تو آخرت میں بھی اگر ایسا ہو تو کیا تعجب ہے۔ بہرحال جنت میں ہر شخص اعلیٰ درجہ کی راحت میں ہوگا کیونکہ ہر چیز اس کی رغبت اور مذاق کے موافق ہوگی۔

---

(۱) گناہوں کے ارتکاب کی وجہ سے مزاج ایسا خراب ہوگیا تھا کہ جنت کی نعمتوں کا مزہ ہی نہ آتا جیسے جس پر صفراء کا غلبہ ہو اس کو گلاب جامن کھانے کا لطف نہیں آتا اس لئے جہنم میں باطنی صفائی کر کے جنت میں بھیجا گیا تاکہ صحیح معنی میں جنت کی نعمتوں سے لطف اندوز ہوسکے (۲) گھوڑوں کی دیکھ بھال کرنے والا (۳) ڈنڈے سے اس کی خوب پٹائی کی۔

دوزخ میں خیالی راحت بھی نہ ہوگی

یہ مطلب نہیں کہ ہر شخص اپنی راحت کے متعلق فی نفسہ اعلیٰ ہونے کا اعتقاد بھی رکھے گا تاکہ معقولی صاحب کا اعتراض وارد ہو۔ غرض وہاں کوئی جہل میں نہ ہوگا اسی طرح دوزخ میں شدت غم کی وجہ سے ہر شخص اپنے کو سب سے زیادہ معذب سمجھے گا خواہ اتنا علم اجمالاً ہو کہ میں فلاں شخص سے درجہ میں کم ہوں مگر چونکہ ہر شخص کو اس کے تخیل سے زیادہ عذاب ہوگا اس لیے وہ اپنے عذاب کو تفصیلاً دوسرے کے عذاب سے کم نہ سمجھے گا اور خواہ اہل جہنم کو تفاوت (۱) درجات کا بھی علم نہ ہو کیونکہ اگر جہنم میں جہل مرکب میں ابتلاء ہو تو اس سے کوئی مخدور (۲) لازم نہیں آتا وہ دارالعذاب ہے (۳)۔ ممکن ہے کہ حسی عذاب کے ساتھ معنوی عذاب جہل مرکب کا بھی مجتمع ہو کیونکہ دنیا میں ایک طریق صبر کا یہ بھی ہے کہ اپنے سے زیادہ مصیبت زدہ کو دیکھ لیا جاوے اس سے بھی کلفت کم ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ میرے پاس جوتا نہ تھا اس وجہ سے رنجیدہ تھا۔ ایک شخص کو دیکھا کہ اس کا پاؤں ہی ندارد ہے تو میں نے شکر کیا کہ میرے پاس پاؤں تو ہے تو جہنم میں خیالی راحت بھی نہ ہوگی کہ یہی سمجھ کر دل کو بہلا لیا جائے کہ ہم فلاں سے کم عذاب میں ہیں وہاں چین کا کیا کام، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سے دور رکھے۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت ذات من حیث ہی ذات بدون لحاظ شان نبوت (۴) کے مطلوب نہیں کیونکہ ایسی محبت تو ابوطالب کو بھی تھی مگر وہ نجات کے لیے کافی نہ ہوئی بلکہ مطلوب وہ محبت ہے جو شان نبوت کی وجہ سے ہو جس کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کا اتباع علمی و عملی لازم ہے۔

نافرمانی کے ساتھ محبت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم باعث نجات نہیں

اب میں پوچھتا ہوں ان لوگوں سے جن کے ہاں رات دن اس قسم کے وعظ ہوا کرتے ہیں کہ اے زناکار بھائیو! اے شرابی بھائیو! جو چاہو کرو، تقویٰ کی کچھ ضرورت نہیں۔ بس حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھو، اسی سے نجات ہو جاوے گی اور ان وہابڑوں

(۱) دوزخ والوں کو دوزخ کے درجات میں فرق کا علم بھی نہ ہو (۲) کوئی نقصان (۳) عذاب کا گھر (۴) حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی محبت کہ جس میں شان نبوت کا لحاظ نہ ہو مطلوب نہیں۔

کو نجات نصیب نہ ہوگی۔ ارے ظالمو! تم مسلمانوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت بڑھانے کی ترغیب دو اس سے ہم منع نہیں کرتے بلکہ ہم خود ترغیب میں شامل ہیں مگر نافرمانی میں دلیری کیوں کرتے ہو۔ بھلا نافرمانی کے ساتھ جو محبت ہو اگر وہ محبت نجات کے لیے کافی ہے تو پھر یہ لوگ ابوطالب کی محبت کو کافی کیوں نہیں کہتے ان کو تو ایسی محبت ان لوگوں سے بھی زیادہ تھی مگر جب ان کی اتنی محبت بھی بوجہ اتباع نہ کرنے کے کافی نہیں ہوئی تو پھر ان مدعیوں کی تھوڑی سی محبت باوجود نافرمانی کے کیسے کافی ہوجاویگی، رہا تفاوت ایمان وکفر کا یعنی ابوطالب ایمان نہ لائے تھے اور یہ لوگ مؤمن ہیں۔ سو اس تفاوت کا انکار نہیں لیکن اس سے یہ کیسے لازم آیا کہ سب معاصی بدون عقوبت (۱) کے بخش دیئے جاویں گے۔ البتہ ایمان سے اتنی توقع ضرور ہے کہ کبھی نہ کبھی بخشش ہوجاوے گی مگر یہ تو نہیں کہ دوزخ میں بالکل ہی نہ جاویں اور بعض گنہگاروں کو جو بالکل معاف کردیا جاوے گا اول تو وہ کسی حسنہ یعنی نیکی کی برکت سے ہوگا اور جب گناہوں پر دلیری ہے تو نیکی کا وجود ہی دشوار ہے۔ چہ جائیکہ ایسے درجہ کی نیکی ہو جس سے گناہ معاف کردیئے جاویں۔ دوسری یہ بات یعنی بالکل معاف ہوجانا موعود تو نہیں (۲) جس کی بناء پر یقین ہوسکے، بہت سے بہت محتمل ہے (۳) اب خود ہی انصاف کرو کہ احتمال مغفرت کی بناء پر معاصی کی اجازت دینا کیسا ہے۔ درحقیقت یہ لوگ لصوص (رہزن) ہیں اور یہ نری محبت جس کے ساتھ اتباع نہ ہو شرعی محبت نہیں بلکہ لغوی محبت ہے۔

حقیقی محبت

اصل میں محبت وہی ہے جو اتباع کے ساتھ ہو جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے ﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾ (۴) سے ثابت ہوتا ہے۔ یعنی اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو۔ ابن المبارکؒ فرماتے ہیں۔

تعصی الالٰہ وانت تظھر حبہ ہذا لعمری فی الفعال بدیع
لو کان حبک صادقا لا طعتہ ان المحب لمن یحب مطیع (۵)

(۱) سب گناہ بغیر سزا معاف کردیئے جائیں گے (۲) اس کا وعدہ نہیں (۳) زیادہ سے زیادہ اسکا احتمال ہے (۴) آلِ عمران: ۳۰/۳۱ (۵) ''تو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے اور اس کی محبت کا اظہار کرتا ہے اپنی جان کی قسم یہ کاموں میں نادر بات ہے اگر تو اللہ کی محبت میں صادق ہوتا تو اس کی اطاعت کرتا اس لیے کہ محبّ محبوب کا مطیع اور فرمانبردار ہوتا ہے۔

یعنی محبّ تو محبوب کا مطیع ہوتا ہے جب اطاعت نہیں تو محبت کی کیا دلیل ہے۔ البتہ ایک ضعیف درجہ محبت کا معصیت کے ساتھ بھی جمع ہوسکتا ہے جس کے لیے شرط یہ ہے کہ معصیت کر کے شرماوے، نادم ہو اور اپنے کو قصور وار، خطاوار سمجھے مگر جو نافرمانی کرتا ہوا شرماوے گا وہ التزام تو کرے گا اتباع کا، اور اس کو ضروری تو سمجھے گا۔

استخفاف معصیت کفر ہے

نہ یہ کہ گناہ پر دلیری کرنے لگے اور دوسروں کو جرأت دلاوے اور معاصی کو ان کی نظر میں خفیف (۱) ظاہر کرے۔ خدا کی پناہ ان لوگوں کو تو اپنے ایمان کی خیر منانا چاہیے کیونکہ فقہاء نے فرمایا ہے۔ استخفاف معصیت (گناہ کو ہلکا سمجھنا) کفر ہے۔

معاصی کے باوجود محبت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک درجہ

اور میں نے جو ابھی کہا ہے کہ محبت کا ایک درجہ معاصی کے ساتھ جمع ہوسکتا ہے یہ بھی ایک حدیث شریف سے ثابت ہے کہ ایک شخص کو چند مرتبہ شراب نوشی میں دربار نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے سزا ملتی رہی مگر باز نہ آیا۔ تیسری یا چوتھی بار گرفتار ہو کر آیا تو کسی نے اس پر لعنت کی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لعنت مت کرو "انہ یحب اللہ ورسولہ" یعنی یہ اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھتا ہے۔ اور اس ارشاد کی وجہ یہ تھی کہ وہ باوجود گناہ ہوجانے کے حکم شریعت کو مانتا تو تھا اور اپنے کو گنہگار مجرم سمجھتا اور معصیت پر نادم بھی تھا اور اب تو نصیحت کا مقابلہ کرتے ہیں۔ احکام شرعیہ کا نام سن کر چڑتے ہیں۔ شریعت کا مضحکہ (۲) اڑاتے ہیں اور پھر اچھے خاصے شاہ صاحب ہیں اگر ان کو محبت ہوتی تو کم از کم دل میں دین کی وقعت تو ہوتی اور اس کے سامنے کچھ لچتے (۳)۔

ایک غریب آدمی کی صاحبِ جاہ کو نصیحت

کالپی کی ایک حکایت ہے جس میں ایک غریب کی نصیحت پر ایک صاحب جاہ نے برا مانا۔ وہ حکایت یہ ہے کہ وہاں قنوج کا ایک عطر فروش گیا اور جمعہ کی نماز میں شریک ہوا، نماز کے بعد اس نے ایک داروغہ صاحب کو دیکھا کہ فرض تو انہوں نے کسی

(۱) ہلکا بتائے (۲) مذاق (۳) کچھ جھکتے۔

طرح مجبور ہوکر امام کے ساتھ اطمینان سے پڑھے کیونکہ امام نے اطمینان سے نماز پڑھی تھی اور یہ اقتداء کی وجہ سے اس کی اتباع میں مجبور تھے مگر سنتوں میں آپ نے ڈاک گاڑی ہی چھوڑ دی کہ جھٹ پٹ برائے نام سجدہ رکوع کرکے فارغ ہوکر چلنے لگے۔ اس گندھی(۱) نے ان کو ٹوکا اور کہا کہ مجھ کو آپ پر بہت رحم آتا ہے کہ آپ اپنا کام حرج کرکے تو اتنی دور تکلیف کرکے آئے مگر غرض حاصل نہ ہوئی۔ آپ سنتیں اطمینان کے ساتھ دوبارہ پڑھ لیجئے، داروغہ صاحب نے یہ سنتے ہی غریب کو دھمکادیا کہ تیری یہ مجال جو ہم پر خوردہ گیری کرے(۲)، ہٹ دور ہوتو ہوتا کون ہے؟ آج کل یہ حالت ہے اور یہ برتاؤ ہے احکام کے ساتھ، مجھ کو مقصود تو یہی جزو ہے مگر آگے تتمیم بھی کرتا ہوں کہ گو داروغہ جی نے اسے دھمکادیا مگر اس نے پھر کہا کہ میں آپ کا خیر خواہ ہوں، آپ کے بھلے کی کہتا ہوں، مجھ کو جو چاہو کہہ لو مگر نماز دوبارہ پڑھ لو۔ داروغہ صاحب نے سپاہی سے کہا کہ اس کو ہٹادو، سپاہی نے مارا، دھمکایا مگر وہ یہی کہتا رہا کہ جو چاہو کرو مگر نماز دوبارہ پڑھ لو، میں بدون نماز پڑھے ہرگز نہ جانے دوں گا اور ٹانگوں میں لپٹ گیا، اس پر مجمع اکٹھا ہوگیا، آخر دوسروں نے بھی داروغہ صاحب سے کہا کہ ایسی بھی کیا ضد ہے جو اپنے نفع کی بات بھی نہیں مانتے آپ دوبارہ نماز پڑھ لیں اس میں آپ کا حرج ہی کیا ہے ثواب کی بات ہے۔ مجبوراً داروغہ صاحب نے سنتیں دہرائیں اور گندھی کے سامنے اچھی طرح اطمینان سے پڑھیں۔ آخر برائی کیا ہوئی، اگر پہلے ہی اچھی طرح پڑھ لیتا تو کیا بگڑ جاتا۔ اس واقعہ کی تمام شہر میں شہرت ہوگئی حالانکہ ظاہر میں وہ گندھی بیچارا پٹا تھا، ذلیل ہوا تھا مگر بڑی نیک نامی ہوئی کیونکہ مظلوم ہونا رسوائی نہیں، گو ظاہر میں ذلت معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ اس قصہ میں اس کا مشاہدہ ہوا، چنانچہ وہ گندھی صاحب جدھر جاتے ہیں ہر شخص ان کو بلاتا ہے کہ میر صاحب یہاں تشریف لائیے۔ کیونکہ اکثر لوگ گندھیوں کو میر صاحب کہتے ہیں نہ معلوم کس بناء پر کہتے ہیں سب سید تھوڑا ہی ہوتے ہیں۔ غرض کوئی ان کی دعوت کرتا، کوئی نذرانہ دیتا۔ اس نے کہا صاحبو! مجھے اس کی ضرورت نہیں میں تو تاجر ہوں میرے ساتھ تو آپ کا یہی احسان بہت ہے کہ میرا عطر خرید لیا جاوے۔

(۱) عطر فروش (۲) اعتراض کرے۔

چنانچہ بہت جلد وہ عطر بک گیا پھر اور لائے وہ بھی جلدی ختم ہوگیا وہ صاحب پیر ہی بن بیٹھے۔ خیر ان داروغہ صاحب نے لوگوں کے کہنے سے نماز تو پڑھ لی، یہ بھی غنیمت ہے بعض لوگ تو ایسے ہیں کہ نصیحت سے کبھی نہ پڑھیں۔

وعظ و نصیحت کا ہر شخص اہل نہیں

چنانچہ کان پور میں ایک صدر منصرم (۱) تھے، نمازی تھے مگر بغیر جماعت کی نماز پڑھا کرتے تھے، مسجد میں نہ آتے تھے۔ ایک مولوی صاحب نے ان کو جماعت کی تاکید کی۔ انہوں نے کہا مجھ کو دق نہ کرو مگر مولوی صاحب اصرار کرتے رہے۔ ایک دن شیطان سوار ہوا کہ جاؤ ہم نماز ہی نہیں پڑھتے، کرلو ہمارا کیا کرتے ہو، غرض پھر عمر بھر نماز پڑھی ہی نہیں۔ اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وعظ و نصیحت ہر ایک آدمی کا کام نہیں ہے اسی لئے میں اپنے اہل علم دوستوں سے کہا کرتا ہوں کہ ابتدائے سلوک میں وعظ و نصیحت نہ کیا کریں کیونکہ علاوہ بعض باطنی مقاصد کے کہ اس کو اہل طریق جانتے ہیں۔ ایک خرابی یہ ہوتی ہے کہ قبل تکمیل تربیت کے نہ فہم درست ہوتا ہے نہ نیت اس لیے احتمال ہے ان کی نصیحت کے بے محل اور بے اثر ہونے کا اور بعض جگہ مضر ہونے کا مگر بعض جگہ لوگ اس ممانعت سے متوحش ہوتے ہیں (۲) کہ طاعت سے کیوں ممانعت کی جائے۔ اس کے متعلق مجھ کو اپنا ایک واقعہ یاد آگیا کہ یہاں ایک ذاکر نے دوسرے ذاکر کو ترفع اور تحقیر کے لہجے میں (۳) کچھ نصیحت کی، مجھ کو اطلاع ہوئی، میں نے بلا کر پوچھا کہ آپ اپنا کام کرنے آئے ہیں یا دوسرے کا، انہوں نے جو جواب دیا اس سے یہ مفہوم ہوا کہ امر بالمعروف تو عبادت ہے تو یہ بھی اپنا ہی کام ہے مولوی سے جیتنا بڑا مشکل ہے مگر میں نے کہا کہ عبادت میں کچھ شرطیں بھی ہوتی ہی یا نہیں' کہا ہاں! میں نے کہا امر بالمعروف کی (نیک باتوں کا حکم کرنا) شرطیں آپ کو معلوم ہیں؟ جواب دیا کہ اس کی شرطیں تو معلوم نہیں، میں نے کہا سنئے ان شرائط میں سے ادنیٰ شرط یہ ہے کہ عین امر بالمعروف کے وقت اپنے کو اس سے حقیر سمجھے ورنہ وہ نصیحت اللہ کے لئے نہ ہوگی نفس کے لیے ہوگی اور جس عبادت میں خلوص نہ ہو وہ عبادت ہی نہیں ہے۔

(۱) منتظم (۲) پریشان ہوتے ہیں (۳) بڑائی اور حقارت کے انداز میں۔

کلید در دوزک ست آں نماز کہ درپیش مردم گزاری دراز(۱)

یہ مقدمات منوانے کے بعد ان سے کہا کہ آپ نے جو دوسروں کو نصیحت کی تھی اس نصیحت کی حالت میں تم نے اپنے کو افضل اور دوسرے کو حقیر سمجھا تھا یا نہیں؟ اقرار کیا کہ واقعی ایسا ہوا میں نے کہا اب امر بالمعروف سے ممانعت کی وجہ سمجھ میں آئی، کہا ہاں آ گئی۔ غرض اتنے دلائل کے بعد اس خدا کے بندہ نے مانا کہ بے شک غلطی ہوئی، میں نے کہا کہ اس غلطی کا علاج کیا، کہنے لگے جو تجویز کیا جائے۔

ہر ذکر موجب قرب نہیں

میں نے کہا علاج ہوتا ہے ازالہ سبب سے اور اس غلطی کا سبب تمہارا ذکر و شغل ہے تم ذکر و شغل کر کے اپنے کو بزرگ اور دوسروں کو حقیر سمجھنے لگے ہو اس کو چھوڑ دو کیونکہ ہر ذکر موجب قرب نہیں بلکہ بعض ذکر موجب بعد ہوتا ہے اور وہ مطلوب نہیں۔ کما قیل

بہرچہ از دوست دامانی چہ کفر آں حرف وچہ ایماں
بہرچہ از یار دور افتی چہ زشت آں نقش وچہ زیبا (۲)

غرض یہ کہ ان کو ذکر سے منع کر دیا مگر پھر ساتھ ہی ذکر کا ادب غالب ہوا اور اس کا بالکلیہ موقوف کرانا گوارا نہ ہوا اس لیے چلتے پھرتے ذکر کی اجازت دے دی، صرف ہیئت خاصہ کو موقوف کرا دیا اور ازالہ کبر کے لیے خانقاہ والوں کی جوتیاں سیدھی کرنے کا ان کو مشورہ دیا وہ خود کہتے تھے دس دن میں وہ نفع ہوا جو دس برس میں بھی نہ ہوتا۔

غرض نصیحت کرنا بھی ہر ایک کا کام نہیں ہے۔ جیسا کہ وہ مولوی صاحب جماعت کی جگہ اس شخص سے نماز بھی چھڑوا بیٹھے اس کا وبال دونوں بھگتیں گے وہ تو نماز چھوڑنے کا اور یہ بے طرح اصرار کر کے نماز چھڑوانے کا۔ غرض یہ کہ بعض لوگ حکم شریعت سن کر تعنت (۳) پر اتر آتے ہیں۔ اب بتلائیے کہ کیا محبت ہے؟ یہ تو کفر ہے اگر اس پر بھی کوئی شخص مدعی محبت ہو تو اس کی محبت ایسی ہی محبت ہے جیسا ایک جاہل شخص محبّ اہل بیت کا قصہ ہے کہ اس نے مسجد میں لکھا دیکھا:

(۱) ''وہ نماز دوزخ کے دروزے کی کنجی ہے جو لوگوں کے دکھانے کو لمبی اور دراز کی جائے'' (۲) ''جو بات محبوب کی طرف سے پیش آئے اس میں ایمان و کفر کے کیا معنی دوست کی طرف سے اگر دوری مطلوب ہو تو اس میں خوبصورتی اور بدصورتی کا کیا سوال'' (۳) ضد بازی شروع کر دیتے ہیں۔

چراغ ومسجد ومحراب ومنبر ابوبکرؓ وعمرؓ وعثمانؓ وحیدرؓ (۱)

یہ دیکھ کر آگ بگولا ہوگیا اور چھری لے کر حضرت علیؓ کے نام مبارک پر حملہ کیا کہ ہم تو آپ کی حمایت کرتے کرتے مرمٹے مگر تمہیں جہاں دیکھتے ہیں ان ہی میں بیٹھا پاتے ہیں اور جھلا کر حضرت علیؓ کا نام چھیل دیا۔ ایسے بھی محبین ہیں کیا اب بھی کہو گے کہ نری محبت کافی ہے ہرگز نہیں بلکہ محبت مقرون بالاتباع لازم ہے (۲)

ایک سبق آموز خواب

اس پر مجھے ایک سبق آموز خواب یاد آیا کہ ایک صاحب رہنے والے تو یہاں ہی کے تھے مگر بڑوت (۳) جارہے تھے اور صدق رؤیا میں مشہور تھے اور ان کو مولد شریف سے خاص شغف تھا۔ انہوں نے مجھ کو ایک خط لکھا تھا جس کو میں نے نشر الطیب میں شائع بھی کردیا ہے۔ اس خط میں یہ مضمون تھا کہ انہوں نے حضور ﷺ کو خواب میں دیکھا کہ حضور ﷺ فرماتے تھے کہ ہم اس سے زیادہ خوش نہیں ہوتے جو ہمارا نام زیادہ لے بلکہ اس سے زیادہ خوش ہوتے ہیں جو ہمارے احکام مانے اور گو خواب حجت شرعیہ نہیں مگر یہ خواب دلائل شرعیہ کے موافق ہے اس لیے میں اس کو بیان کررہا ہوں۔ اس خواب کے علاوہ بیداری کے ارشادات مبارکہ دیکھو سب سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اتباع کرو باقی جس کو آج کل محبت کہتے ہیں کہ قصیدہ نعتیہ پڑھ دیا جائے اس کی بابت کہیں بھی امر نہیں۔ (۴)

مدح رسول اکرم ﷺ میں ضرورت اعتدال

بلکہ ایک مرتبہ کسی نے حضور ﷺ کو سیدنا (ہمارے سردار) کہہ دیا تھا آپ ﷺ نے باوجود سید السادات ہونے کے فرمایا ''ذاك ابراهيم ''(۵) کہ سید تو ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ اس سے حضور ﷺ کا مذاق مبارک معلوم ہوگیا کہ حضور ﷺ اپنی زیادہ تعریف پسند نہ فرماتے تھے اسی لیے کہیں یہ نہیں فرمایا: ''امدحونی ''(میری تعریف کرو) کہ میری تعریف کیا کرو بلکہ اگر فرمایا تو مبالغہ فی المدح (تعریف میں مبالغہ) سے منع فرمایا:

(۱) ''چراغ ومسجد ومحراب ومنبر ابوبکر وعمر وعثمان اور علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہیں'' (۲) محبت کے ساتھ اتباع احکام کرنا بھی لازمی ہے (۳) ایک گاؤں کا نام (۴) حکم نہیں (۵) الصحیح لمسلم، الفضائل ب ۴۱ رقم ۱۰، سنن ابی داؤد: ۴۶۷۲۔

"تطرونی کما اطرت النصاریٰ عیسیٰ بن مریم"(۱) اور اگر کسی مصلحت سے حضور ﷺ نے اپنے فضائل بھی بیان فرمائے تو اپنے اوصاف بیان کر کے لافخر پڑھ دیا۔ چنانچہ فرمایا ہے: "انا سید ولد اٰدم ولا فخر"(۲) مطلب یہ ہے کہ سید ولد آدم ہونا بضرورت بیان کرتا ہوں کیونکہ سب کو اپنا درجہ بتلا دینا حکم خداوندی ہے۔ غرض "امدحونی اور اثنوا علی" (میری تعریف اور میری ثنا بیان کرو) نہیں فرمایا اور اتباع کا امر بار بار فرمایا بلکہ یہاں تک تاکید فرمائی کہ اپنی مخالفت کو خداوند تعالیٰ کی مخالفت فرمایا کہ "مَنْ عَصَانِیْ فَقَدْ عَصَی اللّٰہ"(۳) اب بتلاؤ کونسا حق بڑا ہے بس جمع تو دونوں حقوق کو کرنا چاہیے لیکن بڑے حق کا اور زیادہ اہتمام کرنا چاہیے نہ کہ ایک ہی پر اور وہ بھی دوسرے درجہ کا اکتفا کر کے بیٹھ جاویں اور دوسرے حق کا جو کہ اعظم ہے نام بھی نہ لیا جاوے۔ نیز یہ لوگ گو اس ذکر ومدح کو محبت کامل خیال کرتے ہیں مگر دراصل ان کی یہ مدح حضور ﷺ کی مدح بھی نہیں ہے کیونکہ ہر شخص کی مدح(۴) اس کے مذاق کے موافق ہوتی ہے اور اگر مذاق ممدوح کے موافق نہ ہو تو وہ درحقیقت مدح نہیں مثلاً اگر کوئی سررشتہ دار کو کلکٹر کے سامنے کلکٹر کہنے لگے تو سررشتہ دار اور کلکٹر دونوں برہم ہوں گے کیونکہ اس نے کلکٹر کی اہانت کی۔ اسی طرح جو لوگ حضور ﷺ کی مدح میں ایسا غلوم کرتے ہیں کہ درجہ الوہیت(۵) تک پہنچا دیتے ہیں وہ حضور ﷺ کی مدح نہیں کرتے بلکہ حضرت حق کی بے ادبی کر کے خدا اور رسول اللہ ﷺ دونوں کو ناخوش کرتے ہیں اور ایسی گستاخیوں میں گنوار تو معذور بھی ہوسکتا ہے۔ جیسا کہ ایک تحصیلدار کا نام چراغ علی تھا، اس نے ایک مقدمہ کا فیصلہ کیا تو جس شخص کے موافق فیصلہ ہوا تھا وہ کوئی دیہاتی تھا اس نے خوش ہوکر دریافت کیا کہ تحصیلدار صاحب تیرا کیا نام ہے بتلایا کہ چراغ علی تو وہ گنوار کہتا ہے کس سوہرے (سسرے) نے تیرا نام چراغ علی رکھ دیا تُو تو (مشعل علی) ہے۔ اسی طرح ایک مقدمہ میں حاکم نے ایک گنوار سے دریافت کیا کہ یہ لڑکا تیرا رشتہ

(۱) "میری تعریف میں مبالغہ نہ کرو جیسا کہ عیسائیوں نے عیسیٰ ابن مریم کی تعریف میں مبالغہ کیا ہے" الصحیح للبخاری:۴/۲۰۴، الصحیح لمسلم، القدر ب ۷، رقم:۳۴ (۲) "میں اولاد آدم کا سردار ہوں فخر کی بناء پر نہیں کہتا" المستدرک للحاکم:۲/۶۰۴، کنز العمال:۳۲۰۴۰ (۳) (یعنی جس نے میری مخالفت کی اس نے خداوند تعالیٰ کی نافرمانی کی) الصحیح لمسلم الامارۃ:۳۳، مسند احمد ۲/۲۵۳ (۴) تعریف (۵) خدا کے درجہ میں۔

میں کیا ہوتا ہے؟ کہا یہ میرا کڈھیلڑا ہے۔(۱) یہ ثقیل لغت اس بیچارے نے کیوں سنا تھا وہ حیران ہوا کہ یہ کونسا رشتہ ہے۔ اس نے اس کے معنی دریافت کیے تو آپ نے کیا خوب تفسیر سے بتلایا کہ جیسے تیرا باپو مرجاوے اور تیری ماں مجھے کرلے اور تو اس کی گیلوں (ہمراہ) آوے تو تو میرا کڈھیلڑا ہوا، اب بھی سمجھا، کہا ایسا سمجھا کہ عمر بھر بھی نہ بھولوں گا مگر وہ گنوار تھا اس لیے اس کی گرفت نہیں ہوئی اگر کوئی مہذب اس لغت کی برسر عدالت بھی تفسیر کرے تو کیا اس کو توہین عدالت کے جرم میں جیل خانہ نہ بھیج دیا جاوے۔

مضامین نعت میں گمراہ شعراء کا غلو

میں کہتا ہوں کہ یہ لوگ جو آج کل حضور ﷺ کی مدح میں حد سے زیادہ غلو کرتے ہیں اگر ان کو منع کیا جاوے تو محققین سے مزاحمت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم شاعر ہیں اور شاعر معذور ہیں کیا یہ گنوارپن کی مد میں معذور ہوسکتے ہیں ہرگز نہیں بلکہ حضور ﷺ کی جو تعریف یہ لوگ خلاف شریعت کرتے ہیں وہ اہانت ہے انبیاء کی (۲) حتی کہ بعض کے کلام میں حق تعالیٰ کی اہانت موجود ہے۔ غضب کی بات ہے کہ حب رسول اللہ ﷺ کا دعویٰ اور یہ اقوال، چنانچہ کسی بے ادب نے کہا ہے۔

طواف کعبہ مشتاق زیارت کو بہانہ ہے کوئی ڈھب چاہیے آخر رقیبوں کی خوشامد کا

یعنی اے رسول اللہ ﷺ حج سے اصل مقصود تو آپ ﷺ کی زیارت ہے مگر رستہ میں مکہ مکرمہ ہے جو بیت اللہ ہے اور وہ مثل ہمارے آپ ﷺ پر عاشق ہونے کے سبب ہمارا رقیب ہوا اور ہے زبردست اس لیے اس کی بھی خوشامد کرتے ہیں اور کعبہ کا طواف کرکے اس کو پھسلاتے ہیں تاکہ سفر مدینہ میں مزاحم نہ ہو، خدا کی پناہ ایسے ایسے ملحد اور بے دینوں کو عاشق رسول ﷺ کہا جاتا ہے اول تو یہ کلام کفری ہے۔ دوسرے اس کا مضمون بھی غلط ہے کیونکہ مدینہ کے ہر راستہ میں کعبہ کہاں پڑتا ہے۔ مثلاً جو لوگ شام کی طرف سے آتے ہیں ان کے راستہ میں مدینہ پہلے آتا ہے پھر کوئی اس سے پوچھے کہ وہ لوگ مکہ میں کیوں آتے ہیں۔ بس ان لوگوں میں نہ دین ہے نہ عقل ہے اپنے منہ میاں مٹھو بنتے ہیں کہ کیا اچھا شعر کہا ہے،

(۱) جب کسی عورت کے شوہر کا انتقال ہوجائے اور وہ دوسرا نکاح کرے جبکہ پہلے شوہر سے اس کا ایک بیٹا ہو تو وہ دوسرے شوہر کا کڈھیلڑا یعنی ربیب بیٹا کہلائیگا (۲) انبیاء کی توہین۔

واہ واہ، اس واہ واہ کا قیامت میں مزہ معلوم ہوگا۔ میں آپ کو ایک معیار بتلاتا ہوں اس سے جائز ناجائز مدح کا پتہ چلنا نہایت آسان ہے وہ معیار یہ ہے کہ مدح کے وقت یوں غور کر کے دیکھئے کہ حضور ﷺ اگر اس مجلس میں تشریف رکھتے ہوں تب بھی آپ کے سامنے یہ کلام کہہ سکتا ہے یا نہیں؟ اگر اس وقت بھی کہنے کی ہمت ہو تو جائز ہے ورنہ جائز نہیں اور جو ایسی مدح ہو نہ وہ مدح ہے نہ نعت ہے بلکہ اس شاعر کی ناک میں ناتھ ہے۔ (۱)

شاعرانہ گستاخی

اسی طرح ایک اور شعر ہے:

پے تسکین خاطر صورت پیراہن یوسف محمد کو جو بھیجا حق نے سایہ رکھ لیا قد کا

یعنی جیسے یعقوب علیہ السلام نے اپنی تسلی کے واسطے حضرت یوسف علیہ السلام کا کرتہ مبارک رکھ لیا تھا اسی طرح حق جل جلالہ نے آنحضرت ﷺ کا سایہ اپنے پاس رکھ لیا کہ تسلی رہے، کیا (نعوذ باللہ) حضور ﷺ دنیا میں آکر خدا سے غائب ہوگئے تھے اور نظر نہ آتے تھے، کیا (نعوذ باللہ)، حق تعالیٰ کو سکون کی بھی ضرورت ہے۔ ناس ہو ایسی جہالت کا شاعر نے اپنے نزدیک حس تعلیل برتی ہے اور اس پر نازاں ہے، اول تو وہ روایت ہی متکلم فیہ ہے جس میں حضور ﷺ کے سایہ نہ ہونے کا بیان ہے، دوسرے خود اس روایت میں سایہ نہ ہونے کی وجہ بھی موجود ہے کہ آپ پر ابر سایہ فگن رہتا تھا اس لیے حضور ﷺ کا سایہ نہ ہوتا تھا اور یہ علت کیسے ہوسکتی ہے جو شاعر نے بیان کی ہے، کیا وہ خدا کو حاضر و ناظر نہیں جانتا، یہ تو حق تعالیٰ کی شان میں دو شعروں کا مختصر بیان تھا، اب اہانت انبیاء کا نمونہ سنئے۔ ایک شخص نے کہا ہے:

بر آسمان چہارم مسیح بیمار ست تبسم تو برائے علاج درکار ست (۲)

کیا شاعر صاحب دیکھنے گئے تھے کہ حضرت مسیح بیمار ہیں۔ غرض یہ مضمون بالکل غلط ہے۔ عالم علوی (۳) میں مرض کا کیا کام اور حضرت یوسف علیہ السلام کو تو

(۱) نکیل ڈالی جائے (۲) ''چوتھے آسمان پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام بیمار ہیں، آپ کا تبسم علاج کے لئے درکار ہے'' (۳) آسمانوں پر بیماری کا کیا کام۔

شاعروں نے (نعوذ باللہ) زرخرید بنارکھا ہے، ان کا ذرا بھی ادب نہیں کرتے۔ ایک مداح نے حضرت یعقوب علیہ السلام کی بے ادبی کی ہے۔ مشہور ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی بینائی جاتی رہی تھی اور تو ان کے بالکل نابینا ہونے میں اختلاف ہے۔ بعض کا قول ہے کہ بینائی کمزور ہوگئی تھی کیونکہ اکثر علماء کے نزدیک انبیاء میں کوئی ظاہری عیب بھی نہیں ہوتا تاکہ لوگوں کو ان سے طبعی نفرت بھی نہ ہو اور اتباع نہ کرنے کے لئے معمولی سا بہانہ بھی نہ ملے اور اگر نابینا ہوئے بھی ہوں تو خلقۃً (۱) نابینا نہیں تھے بلکہ شدت غم سے ہوگئے تھے جس طرح اور عوارض جسمانی وامراض لاحق ہوا کرتے ہیں۔ پس اگر اور امراض کی طرح یہ مرض ہو بھی گیا ہو تو کیا وہ مکرم نہیں رہے اور ان کی گستاخی جائز ہوگئی۔ غرض ایک شاعر نے حضور ﷺ کا سراپا لکھا ہے اور سراپا لکھنے کے لیے ایک سیاہی تیار کی ہے اس کے رگڑنے کے لئے چشم یعقوبی کو توبہ توبہ کھرل گردانا ہے (۲)۔ مولوی محمد حسین صاحب فقیر دہلوی بدعتیوں کے حق میں بڑے سخت تھے انتظام کے لیے کچھ آدمی ایسے بھی ہونے چاہئیں انہوں نے اس کا خوب جواب دیا ہے:

ابھی اس آنکھ کو ڈالے کوئی پتھر سے کچل نظر آتا ہے جسے دیدہ یعقوب کھرل
توبہ ہے یوں ہو کہیں عین نبی (۳) مستعمل کوئی تشبیہ نہ تھی اور نصیب اجہل

(نعوذ باللہ) کتنی بڑی گستاخی ہے نبی کی شان میں کہ ان کی چشم مبارک کو کھرل بنایا ہے۔ افسوس ہے مسلمان کہلا کر ان لوگوں کو ان باتوں کی کیسے جرأت ہوتی ہے۔ درحقیقت ان میں ایمان ہی کی کمی ہے۔

حضرت یونس علیہ السلام کا قصہ اور ان پر فضیلت نہ دینے کی وجہ

حضور ﷺ تو باوجود یقینی افضلیت کے یہ ارشاد فرمائیں ''لا تفضلونی علی یونس بن متیٰ ''(۴) اور یہ مدعیان محبت انبیاء کی اہانت کریں اور اس حدیث میں یونس علیہ السلام کی تخصیص کی وجہ ایک قصہ ہے جس کے اکثر اجزاء کا بیان قرآن شریف میں ہے جس سے ناواقف کو ان پر نقص کا وسوسہ ہوسکتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: ﴿ وَذَاالنُّوْنِ

(۱) پیدائشی (۲) پتھر کا بنا ہوا برتن جس میں حکیم دوائیں رگڑتے اور پیستے ہیں (۳) نبی کی آنکھ (۴) ''کہ مجھ کو یونس علیہ السلام پر فضیلت نہ دو'' کتاب الشفاء للقاضی عیاض: ۱/۲۶۵، اتحاف السادۃ المتقین: ۲/۱۰۵۔

اِذۡذَّهَبَ مُغَاضِبًا﴾ الآیۃ (۱) یعنی وہ اپنی قوم سے خفا ہوکر حق تعالیٰ سے بلاصریح اجازت لیے اپنے اجتہاد سے بستی سے باہر چلے گئے تھے کیونکہ ان کی قوم پر نزول عذاب کی خبر دی گئی تھی اس پر وہ اپنے اجتہاد سے چل دیئے۔ خدا تعالیٰ سے نصاً استفسار نہ کیا (۲) حق تعالیٰ کو ان کی شان کے اعتبار سے یہ بات ناپسند ہوئی کہ بدون حکم کے کیوں چل دیئے، اس کا تدارک یہ کیا گیا کہ جب ان کے راستہ میں دریا آیا اور وہ کشتی میں سوار ہوئے تو کشتی چکر کھانے لگی، لوگ کہنے لگے کہ اس میں کوئی بھاگا ہوا غلام ہے۔ حضرت یونس علیہ السلام بولے کہ صاحبو! میں ہوں بھاگا ہوا غلام مگر سب نے انکار کیا اور کہا کہ آپ صورت سے غلام نہیں معلوم ہوتے، آپ تو بھلے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔

مرد حقانی کی پیشانی کا نور کب چھپا رہتا ہے پیش ذی شعور

واقعی انبیاء علیہم السلام کی صورت سے ان کا عاقل ومہذب اور شریف ہونا کافروں کو بھی معلوم ہوجاتا ہے۔

نور حق ظاہر بود اندر ولی نیک بیں باشی اگر اہل ولی

ولی میں انوار الٰہی نمایاں ہوتے ہیں مگر اس کا ادراک اہل دل کو ہوتا ہے۔

جب ہر ولی کی شان ہے تو نبی کے لئے ''نور حق ظاہر بود اندر'' نبی بدرجہ اولیٰ صادق ہوگا تو کشتی والوں نے آپ کے قول کو نہ مانا اور کشتی کی وہی حالت تھی۔ آخر قرعہ کی تجویز ہوئی کہ جس کا نام قرعہ میں نکلے اسی کو دریا میں ڈال دیا جاوے۔ جب قرعہ بار بار انہیں کے نام نکلا اور یہ بھی اصرار کرتے رہے کہ عبد آبق (۳) میں ہی ہوں تو ان کو مجبوراً دریا میں پھینک دیا گیا۔ وہاں ایک بڑی سی مچھلی آئی اور ان کا ایک لقمہ کرکے چلی گئی۔ چالیس روز تک آپ اس کے پیٹ میں رہے اور تسبیح واستغفار کرتے رہے پھر مچھلی نے آپ کو کنارہ پر اُگل دیا، اتنے دنوں میں ضعف بہت ہوگیا تھا اس لیے حق تعالیٰ نے آپ کی حفاظت کے لیے ایک درخت اُگایا۔ یہ قصہ قرآن شریف میں کئی جگہ آیا ہے۔ اس قصہ سے احتمال تھا کہ شاید کوئی احمق اس کو دیکھ کر یہ سمجھ جاتا کہ حضرت یونس علیہ السلام کا یہ فعل اچھے درجہ کا نہیں اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص طور پر آپ کا نام لے کر منع فرمایا کہ ان

(۱) الانبیاء: ۲ (۲) صراحتاً پوچھا نہیں (۳) بھاگا ہوا غلام۔

پر مجھ کو فضیلت مت دینا یعنی جس نبی کے متعلق تم کو شبہ بھی ہوسکتا ہے ان پر اپنی رائے سے مجھ کو فضیلت نہ دو کیونکہ تم اپنی رائے سے فضیلت دو گے تو عنوان غلط تجویز کرو گے۔ ہاں تفضیل بالنص (۱) کا مضائقہ نہیں جس میں رائے کا اصلاً دخل نہ ہو کیونکہ نص میں جو تفضیل وارد ہے اس میں کسی نبی کی تنقیص لازم نہیں آسکتی اور تفضیل بالرائے میں اس کا قوی احتمال ہے۔ یہ وجہ ہے ممانعت تفضیل کی ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سب انبیاء سے یقیناً افضل ہیں آپ کی تو یہ شان ہے: لا یمکن الثناء کما کان حقه بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر (آپ کی تعریف جیسا کہ آپ کا حق ہے ناممکن ہے۔ قصہ مختصر خدا کے بعد آپ ہی بزرگ ہیں) اسی واسطے آپ نے ''لا فضل لی علی یونس بن متی'' (یونس ابن متی پر مجھ کو فضیلت نہیں) نہیں فرمایا بلکہ ''لا تفضلونی'' فرمایا ہے جب حضور ﷺ کو جملہ انبیاء کے احترام کا اس درجہ اہتمام تھا تو ان کی اہانت کر کے حضور ﷺ کی نعت بیان کرنا، کیا اس کا نام مدح نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے ہرگز نہیں بلکہ وہ اس مدح سے حضور ﷺ کا دل دکھاتے ہیں۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ جس ذکر و مدح کو ان لوگوں نے کمال محبت قرار دے رکھا ہے وہ محبت نہیں بلکہ حضور ﷺ کو ایذا رسانی ہے پھر وہ لوگ کیا منہ لے کر ہم لوگوں پر اعتراض کرتے ہیں کہ یہ حضور ﷺ کا ذکر نہیں کرتے۔

حضور ﷺ کی ولادت ملکوتی

غرض یہ کہ ان کا اعتراض بالکل لغو ہے بلکہ میں نے ثابت کر دیا کہ ہم لوگ ہر وقت حضور ﷺ کے ذکر میں مشغول رہتے ہیں کیونکہ دین کے ہر جزو کا ذکر بواسطہ حضور ﷺ ہی کا ذکر ہے مگر کبھی کبھی میں اس ذکر کو بلاواسطہ بھی کر دیتا ہوں اور یہ ذکر بلاواسطہ کبھی ربیع الاول کے قریب، کبھی اس کے اثناء میں ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ مہینہ مذکور ہو جاتا ہے۔ حضور ﷺ کے تمام کمالات کا اس تذکیر کے اثر سے اس مہینہ میں بھی یا اس کے آس پاس ذکر ہو جاتا ہے (۲) اور مذکر اس طرح ہے کہ آنحضرت ﷺ کی ولادت شریفہ بھی ربیع الاول ہی میں ہوئی ہے اور بقول بعض کے نبوت بھی اس ماہ میں عطا ہوئی

(۱) قرآن وحدیث میں جو فضیلت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مذکور ہے اس کے بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں

(۲) ربیع الاول میں چونکہ پیدائش ہوئی اور اسی ماہ میں نبوت عطاء ہوئی اس لیے آپ ﷺ کے تذکرہ کو دل چاہتا ہے۔

اور وفات بھی اس میں ہوئی اس لیے یہ مہینہ ان کمالات کا مذکّر ہوجاتا ہے اور وفات کے کمالات مقصودہ میں سے ہونے پر میں ایک تعجب کو متفرق کرتا ہوں وہ یہ کہ ولادت شریفہ کی طرح حضور ﷺ کی وفات شریفہ کا ذکر کبھی کیوں نہیں کیا جاتا۔ چنانچہ اہل میلاد سے آپ نے ذکر وفات کبھی نہ سنا ہوگا بلکہ بعض نے منع کردیا ہے حالانکہ وہ میمم ہے اس عالم کے کمالات کی اور میمم کی فضیلت ظاہر ہے اس کا کون انکار کرسکتا ہے۔ یعنی اس عالم کے کمالات کی ابتداء ہے وفات شریف سے، گویا وفات درحقیقت ولادت ہوتی ہے۔ عالم ملکوت میں۔ اور جیسا ولادت اشرف ہے ایسا ہی اس کا ذکر بھی افضل ہوگا۔ پس وفات شریف کا تذکرہ بھی کبھی کبھی کرنا چاہیے۔ چنانچہ میں نے اپنے ایک وعظ میں وفات کا ذکر کرکے یہ ثابت کیا ہے کہ حضور ﷺ کی وفات بھی ولادت ہی ہے یعنی ولادت ملکوتیہ اور اس وعظ کا نام ''المولد البرزخی'' رکھا ہے۔ غرض کہ رسول اللہ ﷺ کی ولادت ناسوتیہ بھی ربیع الاول ہی میں ہے اور ولادت ملکوتیہ بھی۔

فضیلت ماہ ربیع الاول

اور باقی تمام واقعات بین الربیعین ہیں(۱) اس لیے یہ مہینہ سب کمالات کا مذکّر ہوجاتا ہے کیونکہ وہ ملفوف ہیں(۲) ربیعین کے درمیان میں اسی لیے ماہ ربیع کی فضیلت میں ملا علی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

لهذا الشعر فی الاسلام فضل ومنقبته تفوق علی الشهور
ربیع فی ربیع فی ربیع ونور فوق نور فوق نور (۳)

غرض اس بناء پر ربیع الاول کے قریب یا اس کے اثناء میں گاہ گاہ میرا معمول ہے کہ مقصوداً بلاواسطہ بھی حضور ﷺ کا ذکر کیا کرتا ہوں اسی وجہ سے اس سال کے ماہ صفر میں میں نے آیت ﴿قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ

(۱) ربیع الاول اور ربیع الثانی کے درمیان میں (۲) ربیع الاول اور ربیع الثانی نے اس کا احاطہ کیا ہوا ہے (۳) ''اسلام میں اس مہینہ کی بڑی فضیلت ہے اور اس کی منقبت تمام مہینوں پر فوقیت رکھتی ہے ربیع ہے ربیع در ربیع میں اور نور ہے جو نور پر نور ہے''۔

اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ﴾[1] کا بیان کیا تھا اور آج کہ خود ربیع الاول کا زمانہ ہے پھر اسی کے متعلق بیان کا قصد کیا کیونکہ گزشتہ جلسہ میں کچھ مضامین اس آیت کے متعلق رہ گئے تھے اور اسی وقت خیال تھا کہ کسی دوسرے جلسہ میں ان کو بیان کروں گا مگر جن کاتب نے وہ مضمون لکھا تھا آج وہ موجود نہیں ہیں اس لیے میں نے اس وقت دوسری آیت اختیار کی۔

کاملین سے صدور خطا ممکن ہے

چنانچہ اس دوسری آیت کے متعلق بیان کرتا ہوں۔ حاصل اس آیت کا یہ ہے کہ ایک واقعہ میں حضور ﷺ کو ارشاد ہے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ خاص برتاؤ کرنے کا غالبًا واقعہ تو سب کو معلوم ہوگا مگر مجملاً میں بھی ذکر کرتا ہوں کہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سے غزوہ احد میں ایک غلطی ہوگئی تھی اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔

گرتے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں وہ طفل کیا گرے کہ جو گھٹنوں کے بل چلے

طفل کے نہ گرنے یعنی اس سے لغزش نہ ہونے پر ایک قصہ یاد آیا۔ ایک محقق خوش مزاج بزرگ سے ایک بچہ نے بیعت کی درخواست کی۔ آپ نے فرمایا کہ کوئی گناہ تو ابھی کیا ہی نہیں توبہ کس چیز سے کراؤں، توبہ تو گناہ سے ہوا کرتی ہے اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ ان حضرت نے گناہ کی رائے دی، بزرگوں کے بعضے کلام کا مطلب سمجھنا بڑا دشوار ہے۔ حقیقت اس کلام کی یہ ہے کہ توبہ کی ضرورت گناہ کے بعد ہے یہ نہیں کہ توبہ کی ضرورت سے گناہ کرنا چاہیے۔ اس کی ایک واضح مثال یہ ہے کہ طبیب کسی تندرست آدمی کی نبض دیکھ کر نسخہ نہ لکھے اور یہ کہے کہ تم کو دوا کی ضرورت نہیں ہے کہ تم بیمار نہیں ہو۔ اس کا یہ مطلب ہوگا کہ بدپرہیزیاں کرکے بیمار ہوجاؤ تاکہ دوسرے مریضوں کی طرح تمہارے واسطے بھی نسخہ لکھا جاوے۔ سو یہ مطلب ہرگز نہیں بلکہ ایک واقعہ کی خبر دینا ہے کہ غیر مریض کے لیے نسخہ نہیں لکھا جاتا۔

---

(۱) ''تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشن چیز آئی ہے اور کتاب واضح کہ اس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ ایسے شخصوں کو جو رضائے حق کے طالب ہوں سلامتی کی راہیں بتلاتے ہیں اور ان کو اپنی توفیق سے تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے آتے ہیں'' المائدۃ: ۵/۱۶۔

نادان دوست

ورنہ اگر یہ مطلب ہو تو سرحدی جیسا واقعہ ہوجاوے گا کہ ایک سرحدی ہندوستان آیا تھا اور کسی مقام پر ڈاکوؤں کے ہاتھ سے زخمی ہوگیا۔ ایک شخص نے اس کی خوب خدمت کی اور علاج کیا، سرحدی نے تندرست ہوکر بہت خوشی سے کہا کہ میاں صاحب اگر کبھی ہمارے ملک میں آنے کا اتفاق ہوجاوے تو ہم سے ضرور ملنا ہم تمہاری خدمت کا صلہ دیں گے۔ اتفاقاً وہ ہندوستانی ایک مرتبہ اُدھر جانکلا اور تلاش کرکے خان صاحب کے گھر بھی پہنچا، خان صاحب اس کو مکان پر بٹھلا کر کہیں غائب ہوگئے اس کی بیوی نے دریافت کیا تم کون ہو، تمہارا کیا واقعہ ہے۔ انہوں نے سارا قصہ بیان کیا اس نے کہا میاں صاحب یہاں سے اسی وقت چل دو کیونکہ خان صاحب اکثر تم کو یاد کرکے یوں کہا کرتے ہیں کہ ہمارا ہندوستان میں ایک دوست ہے جس نے ہمارے زخموں کا علاج کیا اگر وہ محسن دوست یہاں آپہنچے تو میں اس کو زخمی کرکے اس کی خوب خدمت اور مرہم پٹی کروں تو وہ اب چھرا لینے گیا ہے تاکہ اول تم کو زخمی کرے پھر علاج کرے، تم بھاگ جاؤ۔ پس ان حضرات کا مطلب یہ نہ تھا کہ اس سرحدی کی طرح اول گناہ کرے پھر توبہ کرے بلکہ مطلب یہ تھا کہ جب گناہ نہیں ہوا تو توبہ کس چیز سے کراؤں کیونکہ بدون مرض کے علاج کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہاں مفرحات ومقویات کا استعمال ہوسکتا ہے۔

یہ قصہ درمیان میں یاد آیا تھا اصل میں میں یہ بیان کررہا تھا کہ غلطی کا وقوع صحابہ رضی اللہ عنہم سے قابل تعجب نہیں وہ شہسوار تھے جو کبھی کبھی گھوڑے سے گرگئے بلکہ اس میں حکمتیں ہوتی ہیں جن کو اہل طریق نے مختلف عنوانوں سے بیان کیا ہے۔ چنانچہ ایک عنوان جو سب سے بڑھ کر ہے وہ ہے جس کو نظامی فرماتے ہیں:

گناہ من از نامدے درشمار ترا نام کے بودے آمرزگار(۱)

احمق کی حکایت

مگر یہ ناز ہے جو ہر شخص کو زیبا نہیں اس لیے آپ نہ کرنے لگیں ورنہ کبھی وہ حال ہو جیسے ایک احمق شخص نے ایک ولایتی کو دیکھا کہ وہ اپنے گھوڑے کو بڑے پیار سے دانہ

(۱) ''اگر میرے گناہ گنتی میں نہ آتے تو تمہارا غفور نام کب ہوتا''۔

کھلا رہا تھا، کابلی لوگ گھوڑے کی بڑی قدر کرتے ہیں اور اس پر خوب خرچ کرتے ہیں، قیمتی قیمتی گھوڑے رکھتے ہیں، گھوڑے کے قیمتی ہونے پر ایک کابلی تاجر کا قصہ یاد آیا کہ وہ کسی رئیس کے پوچھنے پر اپنے گھوڑے کی بڑی قیمت کہہ رہے تھے، خریدار نے کہا تم بڑے گراں فروش(۱) ہو اس نے کیا مزہ کا جواب دیا کہ تم بڑے ارزاں خرید ہو(۲)، غرض وہ کابلی اپنے گھوڑے کو بہت محبت سے دانہ کھلا رہا تھا وہ گھوڑا دانہ کھاتے ہوئے کبھی منہ مارتا کبھی دولتی پھینکتا اور وہ کابلی کہتا بیٹا کھاؤ اور جدھر وہ منہ لے جاتا اسی طرف یہ دانہ لے جاتا۔ اس شخص نے یہ ماجرا دیکھا تو دل میں کہا کہ افسوس ہماری بیوی ہماری اتنی قدر بھی نہیں کرتی جتنی یہ کابلی گھوڑے کی قدر کرتا ہے۔ جب ہماری کچھ قدر نہیں ہوتی تو انسان ہونے سے کیا فائدہ اس سے تو گھوڑا ہی بننا بہتر ہے۔ گھر جا کر بیوی سے کہا کہ ہم اب گھوڑے بنیں گے بیوی نے کہا چاہے تم گدھے بن جاؤ میرا کیا حرج ہے۔ چنانچہ اس نے دو کھونٹے گاڑے اور ایک رسی گلے میں باندھی اور ایک کھونٹے میں پچھاڑی(۳) باندھی اور دم کی جگہ جھاڑو بندھوائی اور دانے کا توبڑہ منہ پر بندھوا کر دولتیاں چلانے لگا اور اصل مقصود کا انتظار ہی تھا کہ بیوی سے کہا تم یوں کہنا کہ بیٹا کھاؤ، بیٹا کھاؤ، اس کود پھاند(۴) میں چراغ جو پیچھے رکھا تھا اس سے جھاڑو میں آگ لگ گئی اس سے کپڑوں میں آگ لگ گئی، میاں کی اگاڑی پچھاڑی لگی ہوئی تھی یہ کس طرح بچتے بیوی بھی احمق کی احمق ہی تھی اس نے محلّہ والوں کو پکارا کہ ارے دوڑو میرا گھوڑا جلا مگر سب نے کہا کہ اس کے گھر میں گھوڑا کہاں سے آیا، مسخری ہے یوں ہی مذاق کر رہی ہے۔ بس آپ گھوڑے بن کر جل کر مرنڈا ہو گئے(۵)، اچھا ناز کیا۔ اسی واسطے کہتا ہوں کہ ہر شخص کو ناز کرنا زیبا نہیں۔ نظامی کا ناز دیکھ کر آپ ناز نہ کرنے لگئے۔

ناز ہر ایک کو زیبا نہیں

مولانا فرماتے ہیں:

ناز را روئے بباید ہمچو ورد　　چوں نداری گرد بدخوئی مگرد(۶)

عیب باشد چشم نابیناؤ ناز　　زشت باشد روئے نازیباؤ ناز(۷)

(۱) بہت مہنگا بیچتے ہو (۲) سستا خریدنا چاہتے ہو (۳) چوپاؤں کے پچھلے پاؤں میں باندھنے کی رسی (۴) اُچھل کود (۵) جل کر خاک ہو گئے (۶) ''نام کرنے کے لیے گلاب جیسے چہرے کی ضرورت ہے جب تم ایسا چہرہ نہیں رکھتے بدخوئی کے پاس بھی نہ جاؤ'' (۷) ''آنکھ اندھی ہو اور کھلی ہو یہ عیب ہے۔ چہرہ بدصورت ہو اس پر ناز ہو یہ بری بات ہے''۔

پیش یوسف نازش وخوبی مکن جز نیاز و آہ یعقوبی مکن(۱)
کیونکہ تم نظامی تو ہونے سے رہے ہاں بدنظامی ہوجاؤ گے

کاملین کی غلطی کا راز

غرض کاملین سے صدور خطا ہونے میں بہت سی حکمتیں ہوتی ہیں ان کی خطا کی مثال سنکھیا مدبر(۲) جیسی ہے۔ سنکھیا کو حکیم مدبر کرکے کھلادے گا تو مفید ہوگا اور ناتجربہ کار ویسے ہی کھالے گا تو مرجائے گا۔ پس یادرکھو کہ صحابیؓ کی خطا کی یہ شان ہے:

گر خطا گوید ورا خاطی مگو ورشود پر خون شہید آں رامشو
خون شہیداں را از آب اولیٰ ترست ایں خطا از صد صواب اولیٰ ترست(۳)

اوراس میں راز یہ ہے کہ ان کی غلطی اکثر اجتہاد سے ہوتی تھی اور ہماری غلطی فساد وعناد سے ہوتی ہے مگر باوجود خطائے اجتہادی ہونے کے سزا اور تنبیہ کے وہ فوراً خطا وار ہونے کا اقرار کرلیتے ہیں۔ اجتہاد کا عذر پیش نہیں کرتے کیونکہ تنبیہ کے وقت تاویل کرنا گستاخ و بے ادب کا کام ہے جیسا کہ آج کل مرض ہے کہ باوجود صریح خطا ہونے کے بھی اقرار کرنا موت ہے۔ جھوٹی جھوٹی تاویلیں گھڑتے چلے جاتے ہیں حالانکہ جھوٹی تاویل تو قبیح ہے(۴) ہی۔

سلف کا مذاق تو یہ تھا کہ صحیح تاویل کو بھی ہر جگہ پسند نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ سفیان ابن عیینہ فرماتے ہیں کہ مجھ کو ''من غشنا فلیس منا''(۵) میں تاویل کرنا پسند نہیں کیونکہ تاویل کرکے اس ارشاد کی غرض فوت ہوجاتی ہے کہ پھر اس سے اس درجہ کا زجر نہیں ہوتا جو مقصود ہے اوران کا یہ قول بالکل درست ہے۔ البتہ خوارج اور معتزلہ(۶) کا استدلال رد کرنے کی وجہ سے تصحیح عقائد کے لیے تاویل کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ وہ

(۱) ''یوسف یعنی کامل کے سامنے نازوخوبی یعنی دعویٰ اظہار کمال مت کرو بجز نیاز واہ یعقوبی کے اور کچھ مت کرو''(۲) زہر جس کے ہلاک کرنے کی صلاحیت کو ختم کردی گئی(۳) ''اگر غلطی کرے اس کو خطا وار نہ کہو اور اگر شہید خون میں لت پت ہوجائے تو اس کو مت غسل دو کیونکہ شہیدوں کا خون پانی سے بہت بہتر ہے اور یہ خطا صد صواب سے بہتر ہے''(۴) بری ہے(۵) ''جو شخص ہم کو دھوکہ دے وہ ہم سے نہیں ہے'' الصحیح لمسلم الایمان: ۱۶۴، مسند احمد ۳:۴۹۸ (۶) دو باطل فرقے۔

مرتکب کبیرہ کو کافر کہتے ہیں اور ایسی حدیثوں سے بھی استدلال کرتے ہیں۔ اس میں تاویل کرکے ان کا استدلال توڑ دیا جاتا ہے لیکن جہاں خائن کو زجر(۱) کرنا ہو وہاں ہم بھی سفیان بن عیینہ ہی کے ساتھ ہیں تاکہ زجر مقصود فوت نہ ہو۔ اسی طرح سزا دینے والا سزا دینے کے وقت یہ نہیں پوچھا کرتا کہ تم نے یہ غلطی قصداً کی ہے یا اجتہاد سے کی ہے تربیت کا مقتضا یہی ہے کہ غلطی کو غلطی ہی ظاہر کیا جاوے اور گو حق تعالیٰ نے نہیں فرمایا کہ صحابہؓ کی یہ غلطی اجتہاد سے تھی مگر اس کے خلاف کی بھی تصریح نہیں۔ پس مسکوت عنہ ہے(۲) اب اگر کسی اور طریق سے اس کا خطا اجتہادی ہونا ثابت ہوجاوے تو انکار کی گنجائش نہ رہے گی۔ چنانچہ دوسرے دلائل سے اس کا اجتہادی ہونا معلوم ہے اس کی مختصر تقریر بھی عنقریب آتی ہے۔

شان نزول آیت متلوہ

اب میں قصہ بیان کرتا ہوں۔ شروع میں یوں ہوا تھا کہ حضور اکرم ﷺ نے غزوہ احد میں ایک گھاٹی پر پچاس تیراندازوں کو بٹھادیا اور یوں ارشاد فرمایا کہ تم اس گھاٹی پر سے چاہے ہمارا کچھ ہی حال ہو ہٹنا نہیں اس کے بعد جب لڑائی شروع ہوئی اور کفار بھاگنے لگے تو ان پچاس صحابہؓ میں سے اکثر کی رائے یہ ہوئی کہ چلو غنیمت کی لوٹ میں ہم بھی شریک ہوں۔

کثرت رائے کا حکم

یہاں ایک بات ضمناً بیان کرتا ہوں کہ یہاں سے کثرت رائے کا مسئلہ بھی معلوم ہوگیا کہ باوجود کثرت رائے پر عمل کرنے کے بھی اس فعل کو شرعاً ناپسند کیا گیا۔ جب صحابہؓ کی رائے کا یہ حال ہے تو پھر ہم کس شمار میں ہیں نہ معلوم آج کل کثرت رائے کو کس بناء پر معیار صواب قرار دے رکھا ہے۔ شریعت میں اس کی کوئی اصل نہیں، فقط اہل یورپ کی تقلید سے ایسا کرتے ہیں باوجودیکہ دعویٰ کرتے ہیں ان کی مخالفت اور مقاطعت (۳) کا اور یہ بھی یاد رکھو کہ ان صحابہؓ کی یہ شرکت فی الغنیمت (مال غنیمت

(۱) خیانت کرنے والے کو ڈرانا مقصود ہو (۲) اس بارے میں خاموشی اختیار کی گئی ہے (۳) قطع تعلق۔

میں شریک ہونا) کسی دنیوی غرض سے نہ تھی یعنی مال حاصل کرنے کے واسطے نہیں تھی کیونکہ غنیمت کا حکم یہ ہے کہ جو بھی جہاد میں شریک ہو اس کو غنیمت سے حصہ ملتا ہے خواہ وہ لوٹ میں شریک ہو یا نہ ہو، یہ نہیں ہے کہ جس کے جو ہاتھ لگے وہ لے بھاگا بلکہ اول سب غنیمت کو جمع کر کے پھر سب مجاہدین پر تقسیم کیا جاتا ہے۔ جب یہ معلوم ہو گیا تو اگر وہ صحابہؓ گھاٹی پر بیٹھے رہتے تب بھی ان کو اتنا ہی حصہ ملتا جتنا کہ لوٹ میں شرکت کے بعد ملا تو یہ نہیں کہہ سکتے کہ انہوں نے تحصیل مال کے لیے شرکت کی تھی بلکہ محض قتال میں شرکت چاہی تھی تاکہ ثواب میں اضافہ ہو کیونکہ ان لوگوں نے ظاہر میں اب تک کچھ کام نہ کیا تھا صرف گھاٹی پر خالی بیٹھے ہی رہے تھے وہ سمجھے کہ ہم نے کچھ کام نہیں کیا لاؤ جہاد میں ہم بھی عملی حصہ لیں۔

واقعہ احد

خوب سمجھ لو بے علمی کی وجہ سے لوگ صحابہ پر طمع دنیوی کا طعن کرتے ہیں (۱) حالانکہ یہ بالکل غلط ہے جیسا کہ مفصل معلوم ہو چکا۔ غرض ان صحابہؓ نے اپنی یہ رائے سردار سے ظاہر کی کہ ہم غنیمت میں شامل ہونا چاہتے ہیں تو انہوں نے منع کیا اور کہا کہ حضور ﷺ کا ارشادِ عام تھا کہ یہاں سے کسی حال میں نہ ہٹنا اور شرکت غنیمت میں اس کی مخالفت ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ حضور ﷺ کا ارشاد معلل تھا (۲)، یہ مطلب نہ تھا کہ فتح کے بعد بھی گھاٹی سے نہ ہٹنا بلکہ عام ممانعت سے فتح کی قبل کی ہر حالت میں جما رہنا مراد تھا۔ جب فتح ہو گئی تو پھر یہاں ٹھہرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ حضور ﷺ کے ارشاد کی غرض فتح تک ٹھہرنا تھا۔ القصہ وہ سردار تو مع چند آدمیوں کے وہاں پر رہ گئے اور باقی سب شریک غنیمت ہو گئے۔ خالد بن ولید اس وقت تک مسلمان نہ ہوئے تھے ان کو جاسوس نے خبر دی کہ گھاٹی خالی ہو گئی ہے وہ فنون حرب کے بڑے ماہر تھے فوراً سپاہیوں کی ایک تعداد کو لے کر گھاٹی پر آ پہنچے اور جو چند صحابہؓ وہاں رہ گئے تھے ان کو قتل کر کے پیچھے سے مسلمانوں پر حملہ کر دیا کیونکہ گھاٹی پر جو چند مسلمان باقی رہ گئے تھے وہ ان کے

(۱) ان میں دنیا کی محبت ہونے کا طعنہ دیتے ہیں (۲) انہوں نے کہا حضور نے نہ ہٹنے کا حکم فتح نہ ہونے کی صورت میں دیا تھا۔

مقابلہ کو نا کافی ہوئے۔ اُدھر کفار کو جب معلوم ہوا کہ گھاٹی پر ان کے آدمی پہنچ گئے تو وہ بھی بھاگتے بھاگتے واپس لوٹے اس طرح صحابہؓ درمیان میں پس گئے۔ اس ہلچل میں آنحضرت ﷺ کا دندان مبارک شہید ہوگیا اور خود پر پتھر آ کر لگا وہ سر مبارک میں گھس گیا اور حضور ﷺ تکلیف کے باعث ایک جگہ سایہ میں تشریف فرما ہوئے تو شیطان نے اعلان کردیا ''الا ان محمدا قد قتل ''یعنی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) شہید ہوگئے یہ حالت اور یہ اعلان۔ اس پر عشاق کے پاؤں اُکھڑ گئے اس سے زیادہ پاؤں اُکھاڑنے والی بات کون ہوسکتی ہے۔ حضور ﷺ کو اس حالت کی خبر ہوئی تو حضور ﷺ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے بلند آواز کے ساتھ صحابہؓ کو پکارنے کے واسطے ارشاد فرمایا کہ ان کی آواز بہت بلند تھی، رات کو بارہ میل تک جاتی تھی۔ انہوں نے جب آواز دی کہ رسول اللہ ﷺ زندہ وسلامت ہیں اور تم کو بلا رہے ہیں تو صحابہؓ کو ہوش آیا اور سب جمع ہوگئے۔ قرآن مجید میں ''واذ غدوت'' (اور جب آپ صبح کے وقت نکلے) سے اس آیت تک بلکہ بعد تک بھی اس واقعہ کا ذکر ہے جس میں اول غزوہ بدر میں نصرت کرنے کا ذکر ہے پھر غزوہ احد کا بیان ہے اور غزوات کا بیان تو قرآن میں مختصر ہے مگر اس غزوہ کا یعنی جنگ احد کا بہت طویل بیان ہے جس میں صحابہؓ کو ان کی غلطی پر متنبہ کرکے پھر اس واقعہ کی حکمتیں بتلائی گئی ہیں اور مسلمانوں کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ جس طرح فتح ونصرت نعمت ہے اسی طرح بلاء ومصیبت بھی نعمت ہے۔

صحابہؓ کا حال

بہرحال اس واقعہ میں صحابہ کرامؓ سے دو غلطیاں ہوئیں ایک تو گھاٹی پر سے ہٹ جانا اس کا منشاء تو اجتہاد تھا جیسا کہ مفصل بیان کرچکا ہوں۔ دوسری غلطی بھاگنا اور پاؤں اکھڑنا اس میں خطا اجتہاد سے زیادہ عذر تھا یعنی یہ غلطی حیرانی اور بیہوشی کی وجہ سے ہوئی جو کہ آنحضرت ﷺ کی وفات کا اعلان سن کر صحابہؓ پر طاری ہوگئی تھی، کیا اس اعلان کے بعد مسلمانوں کے ہوش قائم رہ سکتے تھے؟ خاص کر جبکہ صحابہؓ کے قلب میں اس کا خیال بھی نہ گزرتا تھا۔ گو یہ عقیدہ ضرور تھا کہ حضور ﷺ کی وفات ہوگئی مگر غلبہ محبت کی وجہ

سے اس جانب التفات نہ ہوتا تھا اور اس پر تعجب نہ کریں کہ یہ کیسے ممکن ہے میں نے خود دیکھا ہے کہ ایک بیوی کو انتقال شوہر پر بے حد صدمہ ہوا اور خود مجھ سے کہا کہ میں یہ سمجھتی تھی کہ مولوی مرا نہیں کرتے اس لیے مجھ کو خیال تھا کہ یہ صدمہ کبھی نہ دیکھوگی وہ بیوی اب تک زندہ ہیں اور ان کے اس خیال کا منشاء محض علماء کی عظمت وعقیدت تھی۔ میں کہتا ہوں کہ سید الانبیاء ﷺ کے متعلق اگر صحابہؓ کی یہ حالت ہو تو کیا تعجب ہے۔

واقعہ وصال سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم

غایت محبت کے سبب صحابہؓ رسول اللہ ﷺ کی حیات ہی کے مشتاق تھے اس کے خلاف کا ان کو وسوسہ بھی نہ ہوتا تھا اسی لئے تو حق تعالیٰ نے حضور ﷺ کی وفات کو بہت اہتمام سے بیان فرمایا ہے: ﴿ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ط اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ﴾(۱) اور صدیق اکبرؓ نے حضور ﷺ کی وفات کے وقت یہی آیت پڑھی تھی جبکہ حضرت عمرؓ جیسا مستقل مزاج شخص بھی گھبرا اُٹھا اور وہ ننگی تلوار لیے کھڑے تھے کہ جو شخص حضور ﷺ کی وفات کا نام لے گا اس کی گردن اتار دوں گا۔ اب سوچو کہ جس کو کبھی یہ خیال ہی نہ ہو کہ حضور ﷺ کی وفات پر ہمارے سامنے ہوگی بلکہ خود اپنی نماز جنازہ حضور ﷺ سے پڑھوانا چاہتے ہوں نہ کہ خود حضور ﷺ کی نماز پڑھنا۔ اس اعلان کو سن کر ان کا کیا حال ہوگا۔

مقتضاء عشق

واقعی عاشق تو یہی چاہا کرتا ہے کہ میں پہلے مروں تا کہ محبوب کو میرے جنازہ پر آ کر میری بے کسی اور ثبات فی العشق کا مشاہدہ ہو کہ محبت میں ایسا پختہ رہا کہ اسی میں مر گیا اور زبان حال سے اس وقت یوں کہتا ہے:

کششے کہ عشق دارد نگذاردت بدنیساں بجنازہ گر نیائی بمزار خواہی آمد(۲)

کبھی وہ اپنے جنازہ پر محبوب کے آنے کی تمنا کرتا ہے اور کبھی کشش عشق سے

---

(۱) ''یعنی اور محمد صرف رسول ہی تو ہیں آپ سے پہلے اور بھی بہت سے رسول گزر چکے ہیں۔ سو اگر آپ کا انتقال ہو جائے یا آپ شہید ہی ہو جائیں تو کیا تم لوگ اپنی ایڑیوں کے بل دین حق سے پھر جاؤ گے'' سورہ آل عمران: ۱۴۴ (۲) ''عشق کی کشش تجھ کو اس طرح نہ چھوڑے گی جنازہ پر اگر نہ آئے تو مزار پر ضرور آوے گا''۔

اس کو مزار پر بلاتا ہے۔ عاشق کبھی نہیں سوچتا کہ محبوب میرے سامنے مرے اور میں اس کی قبر پر جاؤں۔ اس تصور کی اس کو اہمیت کہاں ہوتی ہے۔ جب لیلیٰ مرگئی تو مجنوں کی بری حالت ہوئی اور اس کی قبر پر آیا اس وقت تک اس کو کسی نے بتلایا بھی نہیں تھا کہ لیلیٰ کی قبر کونسی ہے مگر مٹی سونگھ کر خود ہی معلوم کرلیا کیونکہ محبوب کی مٹی بھی عاشق کے شامہ میں ممتاز ہوتی ہے۔ اسی کو حضرت فاطمہؓ دوسرے شعر میں فرماتی ہیں:

ما ذا علٰی من شم تربة احمد ان لا یشم مدی الزمان غوالیا

یعنی جس نے حضور ﷺ کی تربت کو سونگھ لیا اس کو عمر بھر خوشبو سونگھنے کی ضرورت نہیں۔ عشاق کو بوئے محبوب اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ چنانچہ مجنوں بھی اسی طرح لیلیٰ کی قبر پر پہنچا اور وہاں جا کر چیخ مار کر بیہوش ہوگیا، پھر عمر بھر اسی غم میں رہا حتی کہ ختم ہوگیا۔ حقیقت میں محبوب کا عاشق کے سامنے وفات پاجانا سخت صدمہ جان کا ہے اسی کو حضرت فاطمہؓ دوسرے شعر میں فرماتی ہیں:

صبت علی مصائب لوانها صبت علی الایام صرن لیا لیا (۱)

اس سے آپ اندازہ کرلیجئے کہ حضور ﷺ کا سانحہ وفات صحابہؓ کے لیے کیسا جاں کاہ (۲) تھا کہ ایسے بڑے بڑے استقلال والے اس وقت ہل گئے۔ حقیقت میں یہ حضور ﷺ کا معجزہ ہے کہ صحابہؓ سے حضور ﷺ کے بعد بھی دین کا کام لیا گیا ورنہ سانحہ وفات سے سب کے سب معطل ہوجاتے۔ لوگ کہتے ہیں کہ صحابہؓ آپس میں لڑے تھے۔ ارے کہیں ایسے عاشق بھی لڑا کرتے ہیں جو اپنے کو فنا کرچکے ہوں۔ ان حضرات نے نفس کے لیے کچھ نہیں کیا سب کچھ دین کے لیے کیا۔ اس واسطے ان کی سب لغزشیں معاف ہیں، کسی کا منہ نہیں کہ ان پر طعن کرے۔

صحابہ کا طبعی ذوق

بہرحال اس واقعہ میں صحابہؓ سے جو غلطیاں صادر ہوئیں وہ ایسی ہیں کہ دوسرا ان کو غلطی نہیں کہہ سکتا مگر چونکہ وہ بڑے درجہ کے لوگ ہیں اور خدا تعالیٰ کو ان کی تربیت منظور ہے اس وجہ سے ان کو اس خفیف خطا پر لتاڑا گیا (۳) مگر ان کو اس لتاڑ میں بھی مزہ آیا

(۱) ''مجھ پر اس قدر مصیبتیں پڑی ہیں اگر وہ دنوں پر پڑتیں تو راتیں بن جاتے'' (۲) جان لیوا (۳) تنبیہ کی گئی۔

ہوگا کیونکہ اولیاء سے زیادہ صحابہؓ میں بھی ہر مذاق موجود ہے مگر وہ حضرات ان جذبات کو زبان سے کم ظاہر کرتے ہیں اور اگر ظاہر کرتے بھی ہیں تو ان کے الفاظ مؤدبانہ ہوتے ہیں۔ مولوی غوث علی شاہ صاحب سے کسی نے دریافت کیا کہ مولانا رومی اور شیخ عطار اور شیخ اکبر میں باوجود اشتراک مذاق وحدۃ الوجود کے کیا فرق ہے۔ فرمایا پہلے ایک حکایت سن لو کہ تین آدمی کسی گاؤں میں پہنچے اور پانی پینے کسی کنویں پر گئے وہاں ایک عورت پانی کھینچ رہی تھی۔ ان تین شخصوں میں سے ایک نے تو یوں کہا کہ اماں پانی پلادے۔ دوسرے نے کہا میرے باپ کی جورو پانی پلادے۔ تیسرے نے کہا میرے باپ سے یوں توں کرانے والی پانی پلادے۔ معنون سب کا ایک تھا مگر دیکھ لو عنوان کے بدلنے سے کتنا فرق ہوگیا۔ پس مولانا رومی تو اماں والے ہیں اور شیخ عطار اور شیخ اکبر دوسرے تیسرے عنوان والے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ بعض صوفی پھوہڑ ہوتے ہیں وہ الفاظ کا بے باکانہ استعمال کر جاتے ہیں۔ حضرات صحابہؓ ایسا نہیں کرتے ورنہ حقائق سے خالی نہیں۔ صوفیہ کے ہر مذاق کی اصل صحابہؓ میں موجود ہے اور احوال صحابہؓ کو دیکھنے سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ صوفیہ کے اس مذاق کی وہ لتاڑ سے بھی مزہ لیتے ہیں، ایک حدیث سے تائید ہوتی ہے۔ حدیث میں قصہ ہے کہ بعض صحابہؓ کو جنگ احد ہی کے موقع پر منافقین کے لوٹ جانے سے وسوسہ ہوا کہ ہم بھی لوٹ جائیں مگر پھر سنبھل گئے۔ اس کے متعلق قرآن شریف میں ارشاد فرمایا گیا: ﴿اِذْهَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا﴾ (۱) یعنی مسلمانوں میں سے بھی دو جماعتوں نے قصد کیا تھا کہ جنگ سے ہٹ جائیں اور اللہ تعالیٰ ان کے ساتھی (اور مددگار) تھے (اس لیے سنبھل گئے) گو اس میں ان جماعتوں کی رسوائی کردی مگر ایک صحابی اس واقعہ کو بیان فرما کر کہتے ہیں کہ ہم کو اس آیت کے عدم نزول کی خواہش نہیں کیونکہ اس میں ''واللہ ولیھما'' (۲) اللہ ان کے ساتھی تھے) کے نزول سے خوش ہونے کو بیان کردیا اور حضور ﷺ نے تو ایک موقع پر صاف بیان فرمایا: ''مرحبا بمن عاتبنی فیه ربی'' (۳)

(۱) سورۂ عبس: ۸۰/۱ (۲) سورۃ آل عمران: ۱۲۲ (۳) آپکا آنا مبارک ہے جن کی وجہ سے میرے رب نے مجھ ڈانٹا۔ عبداللہ بن ام مکتوم کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کلمات کہے تھے جبکہ آپ پر سورۃ عبس کے ابتدائی آیات کا نزول ہوا عبس و تولی۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود عتاب کا تذکرہ بھی محبوب معلوم ہوتا ہے۔

حکایت حضرت شاہ ابوالمعالی صاحب رحمۃ اللہ علیہ

غرض صحابہ میں صوفیہ کرام کا مذاق تو موجود تھا مگر صحابہ اپنے مذاق بیان کم کرتے تھے اور صوفیہ زیادہ اوصاف بیان کر جاتے ہیں۔ جیسا کہ ایک صاحب کہتے ہیں:

بدم گفتی وخرسندم عفاک اللہ نکو گفتی جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا(۱)

شاہ ابوالمعالی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت ہے کہ آپ نے ایک مرید سے جو مدینہ شریف جارہا تھا فرمایا کہ مزار شریف پر حاضر ہوکر میرا سلام حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کر دینا اس نے پہنچ کر سلام عرض کیا تو آنحضرت ﷺ کی طرف سے اس شخص کو سلام کے جواب میں مکشوف ہوا کہ اپنے بدعتی پیر سے ہمارا بھی سلام کہہ دینا۔ اس نے آکر شاہ صاحب کے پاس جواب پہنچایا مگر بدعتی کا لفظ نقل نہیں کیا۔ شاہ صاحب کو پہلے ہی کشف ہوگیا تھا، فرمایا وہی الفاظ کہو جو حضور ﷺ نے ارشاد فرمائے تھے اس نے کہا کہ حضرت جب آپ کو معلوم ہی ہے تو میرے کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ ارشاد فرمایا کہ سن کر مزہ آوے گا۔ واقعی اس سننے میں بھی لطف ہے اس کے متعلق ابونواس کا شعر مشہور ہے۔

الا فاسقنی خمر اوقل لی ھی الخمر ولا تسقنی سراً متی امکن الجھر (۲)

خود حضور ﷺ نے ایک صحابی سے قرآن سننا چاہا انہوں نے عرض کیا حضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) میں آپ کو سناؤں حالانکہ آپ پر نازل کیا گیا ہے۔ ارشاد فرمایا: ''احب ان اسمع من غیری ''(۳) معلوم ہوا کہ محبوب کے کلام کو دوسرے کی زبان سے سننے میں بھی ایک خاص لطف آتا ہے۔ جب خود رسول اللہ ﷺ سے یہ ثابت ہے تو پھر صوفیوں کی کیا خطا ہے۔ آخر اس مرید نے وہ الفاظ نقل کر دیئے۔ بس آپ سنتے ہی کھڑے ہوگئے اور وجد طاری ہوگیا رقص کرتے تھے اور بار بار یہ شعر پڑھتے تھے:

بدم گفتی وخرسندم عفاک اللہ نکو گفتی جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا(۴)

---

(۱) ''تو نے مجھے برا کہا مگر میں خوش ہوں تیرے لب لعل کے لیے جواب تلخ ہی بہتر ہے'' (۲) ''مجھے شراب محبت پلا اور مجھ سے کہو کہ یہ شراب ہے اور مجھے پوشیدہ مت پلا جب تک ظاہر کرنا ممکن ہو'' (۳) ''پسند کرتا ہوں کہ اپنے غیر سے سنوں'' (۳) ''تو نے مجھے برا کہا ہے مگر میں خوش ہوں تیرے لب لعل کے لیے جواب تلخ ہی بہتر ہے''۔

اور حضور ﷺ نے جو شاہ صاحب کو بدعتی فرمادیا تو ایسے افعال پر جو صورۃً بدعت تھے کیونکہ وہ سماع میں شریک ہوتے تھے مگر وہ بدعت کے حقیقی درجہ میں نہیں پہنچے ہوئے تھے کیونکہ ان کا سماع منکرات ومحرمات سے پاک تھا اس لیے آج کل کے اہل سماع اس واقعہ سے استدلال نہ کر بیٹھیں اور جب ان کا سماع حقیقت میں بدعت کے درجہ پر نہ تھا تو ہم کو اس کی اجازت نہیں کہ شاہ ابوالمعالی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بدعتی کہنے لگیں۔ گو حضور ﷺ نے فرمایا ہے حضور ﷺ کو ادنیٰ سی بات پر گرفت کا حق ہے پھر گرفت بھی محاسبانہ انداز سے نہیں بلکہ محبوبانہ انداز میں جیسا کہ حضرت آدم علیہ السلام کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ﴾(۱) بس یہ حق تعالیٰ کو حق ہے کہ ان کو عصٰی وغویٰ (قصور ہوگیا اور غلطی میں پڑ گئے) جو چاہیں فرمائیں کیونکہ وہ محبوب ہیں اور آدم علیہ السلام محبّ ہیں اگر ہم کہیں گے تو گت بنے گی (۲)، ہاں حکایتاً ونقلاً کہنے کا مضائقہ نہیں۔ جیسا کہ تلاوت قرآن مجید میں ہمیشہ ہی ان الفاظ کو نقل کرتے ہیں پس جس طرح آدم علیہ السلام کی طرف عصیان کی نسبت ہمارے لیے جائز نہیں اسی طرح شاہ صاحب کو بدعتی کہنے کی ہم کو اجازت نہیں۔ اسی طرح آنحضرت ﷺ بعض ازواج مطہرات کو عقری خلقی فرمادیتے تھے مگر ہم تم نہیں کہہ سکتے۔ یہ مضمون درمیان میں اس بات پر آ گیا کہ حضرات صحابہؓ کو غزوہ احد کی لغزش پر جو عتاب کیا گیا ہے ممکن ہے کہ بعض کو اس عتاب میں بھی لذت آئی ہو اس پر یہ حکایت شاہ ابوالمعالی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بیان کردی تھی۔

حضرات صحابہؓ کی اجتہادی غلطی

اس سے پہلے میں یہ کہہ رہا تھا کہ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی یہ لغزش اجتہاد اور عذر کی بناء پر تھی۔ جیسا کہ میرے بیان سے واضح ہوگیا جس سے صحابہ دلگیر تھے (۳) ان کے غم کو حق تعالیٰ نے اس طرح دور کیا کہ فرماتے ہیں: ﴿فَاَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوْا ﴾(۴) اور وجہ یہ فرمائی ''لِكَيْلَا تَحْزَنُوْا'' (تاکہ تم مغموم نہ ہوا کرو) اکثر مفسرین نے اس جگہ لاکو زائد کہا ہے مگر خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میری سمجھ میں

(۱) ''اور آدم سے اپنے رب کا قصور ہوگیا سو غلطی میں پڑ گئے'' (۲) پٹائی ہوگئی (۳) آزردہ دل (۴) ''یعنی تم نے ہمارے نبی کو غم دیا ہم نے اس کے بدلہ میں تم کو غم دیا'' آلِ عمران: ۳/۱۵۳۔

آ گیا کہ لا کا زائد ہونا ضروری نہیں یعنی لا غیر زائد کہنے کی صورت میں خدا نے ایک توجیہ ذہن میں ڈال دی اور زائد تو مجبوری کو کہا جاتا ہے جب توجیہ بن سکے تو زائد کہنے کی کیا ضرورت ہے اور وہ توجیہ بھی نہایت لطیف ہے۔ اول بطور مقدمہ کے یہ سمجھو کہ اگر ہم سے بڑے آدمی کی نافرمانی ہوجائے اور وہ بڑا آدمی ہم کو کچھ سزا دے لے تو شرمندگی ختم ہوجاتی ہے ورنہ قلق ہمیشہ باقی رہتا ہے۔

اس مشاہدہ سے معلوم ہوا کہ شریف آدمی خصوصاً عشاق کی طبیعتوں میں عمر بھر خطا سے غم رہتا ہے جب تک کہ اس کا بدلہ نہ لیا جاوے۔ بس اسی کو حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم اس ہزیمت اور شکست میں جو تم پر مصیبت پڑی ہم نے اس کو تمہاری نافرمانی کا عوض بنالیا ہے تاکہ تم کو یہ غم نہ رہے کہ ہم کو سزا نہیں دی گئی۔ پس اس طرح صحابہ سے بدلہ لے کر آئندہ کے لیے ان کے غم کو ختم کردیا مگر اس سے گو وہ غم تو ختم ہوگیا جو صحابہ کو بدلہ نہ لینے سے ہوتا لیکن ایک دوسرا غم تو باقی رہ گیا کہ حضور ﷺ کی طبیعت پر ان کی طرف سے حزن تھا۔ جب چہرہ مبارک کو دیکھتے کہ پہلی سی بشاشت نہیں ہے تو اور بھی رنج میں اضافہ ہوجاتا۔ صحابہ اس کی کہاں تک تاب لاسکتے تھے۔

صحابہ کی شان

ان کی تو یہ شان تھی کہ ایک صحابی نے قبہ دار مکان بنالیا تھا، آنحضرت ﷺ کا ایک روز اس طرف گزر ہوا تو دریافت فرمایا کہ مکان کس کا ہے؟ صحابہ نے عرض کیا کہ فلاں شخص کا ہے اس کو سن کر حضور ﷺ خاموش ہوگئے اس کے بعد وہ صحابی حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضور ﷺ کا وہ رخ اپنی طرف نہ دیکھا جیسا پہلے تھا بس گھبرا گئے اور صحابہؓ سے دریافت کیا کہ کیا واقعہ ہے، انہوں نے کہا اور کچھ تو ہم کو معلوم نہیں ہاں اتنی بات معلوم ہے کہ تمہارے مکان کو دیکھ کر حضور ﷺ کراہت (۱) کے ساتھ خاموش ہورہے تھے۔ اب گو اس میں یہ بھی احتمال تھا کہ اس سکوت (۲) کا کوئی اور سبب ہو مگر صحابی نے محض احتمال کراہت کی بناء پر فوراً سب مکان گرادیا اور کمال یہ کہ آکر جتلایا بھی نہیں کہ حضور ﷺ میں نے وہ مکان گرادیا ہے، یہ عرض کرنے کی بھی جرأت نہ ہوئی۔

(۱) ناپسندیدگی (۲) اس خاموشی۔

اللہ اکبر کتنی عظمت تھی حضور ﷺ کی ان حضرات کے قلوب میں۔ آج کل کے لوگ ان کی خطا کو دیکھتے ہیں مگر ان کمالات کو نہیں دیکھتے۔

پھر ایک مرتبہ خود حضور ﷺ ہی کا ادھر گزر ہوا تو معلوم ہوا کہ وہ مکان گرادیا گیا ہے۔ اس پر حضور ﷺ نے پختہ اور بلند تعمیر مکان کی مذمت بیان فرمائی۔ غرض حضرات صحابہ حضور ﷺ کے انقباض اور بے رخی کو کہاں برداشت کرسکتے تھے۔

رحمت خداوندی

بس اس آیت میں حق تعالیٰ نے حضور ﷺ کے اس انقباض کو دور فرمایا ہے کیا ٹھکانہ رحمت خداوندی کا کہ اپنے بندوں کو کسی درجہ میں بھی غمگین نہیں رکھتے بلکہ ہر پہلو سے ان کے رنج دور کرنے کی تدابیر فرماتے ہیں۔ بھلا کہاں خدا اور کہاں بندہ اور پھر یہ توجہ بس اس حقیقت کو یا تو اس طرح تعبیر کیجئے کہ خدا کو اس کی کیا ضرورت تھی محض فضل ورحمت ہے یا اس طرح رکھئے کہ خدا ہی کی شان ہے کہ بلاغرض اتنی توجہ فرماتے ہیں۔ غرض جس طرح چاہے تعبیر کیا جاوے ہرحال میں اس سے غایت درجہ کی توجہ معلوم ہوتی ہے اور یہ محض رحمت ہے ورنہ خدا کی شان تو اتنی برتر ہے کہ اگر وہ بندہ کی طرف مطلق التفات نہ فرماتے تو ان کو اس کا حق تھا۔ اگر بندہ برسوں بھی پکارتا تو وہاں شنوائی نہ ہوتی مگر چونکہ خدا کی صفات قدیم ولازوال ہیں اس لیے یہ شنوائی نہ ہونا لغوی معنی میں تو محال ہے مگر عرفی معنی کا اعتبار سے صحیح ہے یعنی عدم توجہ بلکہ بفرض محال (نعوذ باللہ) اگر علم وسمع لازم ذات نہ ہوتے تو بندہ اس قابل بھی نہ تھا کہ اس کے وجود کی خبر بھی اس بارگاہ عالی تک پہنچتی مگر اب تو یہ محال ہے کہ خدا کو کسی کی خبر نہ ہو اور کسی کی بات نہ سنے اسی لیے فرض محال کی قید لگادی تھی مگر اس سے کسی ذہن کو یہ شبہ نہ ہو کہ جب صفات قدیمہ ازلیہ واجبہ کی وجہ سے یہ سب باتیں وغیرہ لازم ہیں تو پھر رحمت خداوندی اضطراری ہوئی کیونکہ صفت رحمت بھی قدیم وواجب ہے اور واجب کا وجود لازم ہے تو اضطراری رحمت میں بندہ پر احسان ہی کیا ہوا۔ یہ شبہ بالکل باطل ہے کیونکہ علم وقدرت وغیرہ صفات تو ایسی ہیں کہ وہ خود بھی قدیم اور ان کا تعلق بھی قدیم ہے اور بعض صفات خود تو قدیم ہیں مگر ان کا

تعلق قدیم نہیں ہے بلکہ حادث اور مشیت پر موقوف ہے۔ مثلاً رحمت، کہ اس کا تعلق تو قدیم نہیں بلکہ حادث ہے جو ارادہ سے ہوتا ہے۔ بس یاد بمعنی علم تو قدیم اور ضروری ہے اور یاد بمعنی توجہ اور رحمت کا تعلق ضروری نہیں اگر حق تعالیٰ اس کو متعلق نہ کرتے تو اس میں کوئی اشکال یا خرابی لازم نہیں آسکتی تھی بس وہ تو محض رحمت کی وجہ سے ہماری طرف توجہ کرتے ہیں:

من نکردم خلق تا سودے کنم بلکہ تابر بندگاں جودے کنم (۱)

رحمت خداوندی کا حق

اسی واسطے ہم کو خدا سے بڑی امیدیں ہیں کہ وہ بلاغرض کے بندوں پر اتنی توجہ فرماتے ہیں۔ مولانا احمد علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سہارنپوری فرماتے ہیں کہ اگر آخرت میں بھی وہی خدا ہے جو یہاں ہے تو پھر کوئی فکر کی بات نہیں ہے کیونکہ یہاں تو وہ ہمارے حال پر بڑی عنایت فرماتے ہیں امید ہے کہ وہاں پر بھی یہی برتاؤ ہوگا کیونکہ یہی خدا تو وہاں بھی ہے اسی لیے بزرگوں نے لکھا ہے کہ جب صفت ورحمت کا سالک پر غلبہ ہو تو اسی مراقبہ میں مشغول رہے کیونکہ حق تعالیٰ کے شیون (۲) مختلف ہیں، سب شیون کے حقوق کا ادا کرنا ضروری ہے۔ بس صفت رحمت کا حق یہ ہے کہ جب سالک پر اس کا ظہور ہو تو اسی کے مراقبہ میں مشغول رہے اور ادھر سے باوجود ان کے استغناء مطلق کے جس کا ابھی اوپر بیان ہوا بندہ کی طرف اتنی توجہ ہونا تو قابل غور ہے ہی مگر اس سے بڑھ کر یہ ہوتا ہے کہ بعض دفعہ ادھر سے بالکل توجہ نہیں ہوتی جس میں مانعیت توجہ کا اثر ہونا چاہیے مگر پھر بھی ادھر سے توجہ ہوتی ہے۔ اللہ اکبر اول تو وہ ذات بلاغرض توجہ کرے پھر بلا طلب طالب کے توجہ کرے یعنی مستغنی اور غیر طالب بندہ توجہ کرے بلکہ روگردان کی طرف التفات ونظر عنایت کرے واقعی غایت کرم ہے۔

اے خدا قربان احسانت شوم ایں چہ احسانت قربانت شوم (۳)

حق سبحانہ وتعالیٰ کی عجیب رحمت

حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ خوش ہوتا ہے اس بندہ سے جو جنت میں

(۱) ''میں نے اس لیے مخلوق کو کہ کچھ فائدہ حاصل کروں بلکہ اس لیے کہ بندوں پر جود وکرم کروں'' (۲) شانیں (۳) ''اے خدا آپ کے احسان پر قربان ہوتا ہوں یہ احسان کیا چیز ہے میں آپ ہی پر قربان ہوں''۔

زنجیروں سے جکڑ کر داخل کیے جاویں گے۔ یہ حدیث بخاری میں حضرت ابو ہریرہؓ سے مرفوعاً مذکور ہے۔ اس حدیث میں عَجِبَ رَبُّنَا (ہمارے پروردگار خوش ہوتے ہیں) کا لفظ آیا ہے۔ بوجہ محاورہ کے خوش ہونے کا ترجمہ کرتا ہوں یہ تو حدیث کا ترجمہ ہوا اور اس کا مطلب بھی خود اسی حدیث میں ان الفاظ سے آیا ہے۔ یعنی ''الا سیر یوثق ثم یوثق یسلم ''یعنی کہ بعض کفار دارالحرب سے زنجیروں میں جکڑ کر لائے جاتے ہیں وہ یہاں دارالاسلام میں آکر مسلمانوں کا طرز عمل دیکھ کر مسلمان ہوجاتے ہیں تو یہ لوگ گویا زنجیروں میں جکڑ کر جنت میں پہنچائے گئے ہیں کیونکہ نہ وہ قیدی بن کر آتے نہ اسلام کی توفیق ہوتی۔ یہ بالکل ایسا ہے جیسا کہ بچوں کو زبردستی پکڑ پکڑ کر اکثر نہلایا جاتا ہے اور وہ روتے ہیں خود میرے ہی بچپن کا قصہ ہے کہ میں سر پر بال تو رکھتا تھا مگر کھیل میں ہفتوں سر نہیں دھوتا تھا اور اس سے بھاگتا تھا۔ ایک بار تائی صاحبہ یعنی بڑی چچی صاحبہ نے کھلی (۱) بھگو کر رکھ لی اور جب میں گھر آیا تو موقع پاکر ایک دم سے کھلی سر پر مل دی تاکہ مجبوراً سر دھونا پڑے۔ کسی نے کیا اچھا کہا ہے

گرنستائی بستم می رسد (۲)

پس یہی حال ان قیدیوں کا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو زبردستی جنت میں بھیجنا چاہتے ہیں۔ تھے تو وہ معاند مگر پکڑ کر قید کر کے ان کو جنت میں لے گئے۔ جاہل صوفیوں نے اس حدیث کے اور معنی گھڑے ہیں کہ عشاق قیامت کے دن جنت میں جانے سے انکار کریں گے کہ ہم نے جنت کے لیے تھوڑا ہی آپ سے محبت کی ہے اس لیے ان کو زنجیروں میں جکڑ کر لیجاویں گے۔

جاہل صوفیوں کی کوتاہیاں

ارے بھائی اس مطلب کی کیا دلیل ہے بلکہ خلاف دلیل ہے کیونکہ یہ تو ایک قسم کی نافرمانی ہے اللہ تعالیٰ جنت میں جانے کا حکم دیں اور وہ نہ مانیں۔ کیا عشاق سے اس کا احتمال ہوسکتا ہے۔ ایسے ہی جاہلوں نے تو صوفیہ کرام کو بدنام کیا ہے اور یہ تو بسا غنیمت ہے کیونکہ یہاں تو مطلب ہی میں گڑ بڑ کی ہے مگر ترجمہ تو حدیث کا نہیں بدلا۔ بعض جگہ تو اس سے بڑھ کر غضب کیا ہے کہ معنی ہی غت رُبود کر دیئے (۳)۔ چنانچہ

(۱) تل یا سرسوں کا پھوک (۲) ''اگر خوشی سے نہ لے گا زبردستی پہنچے گا'' (۳) معنی ہی بگاڑ دیئے۔

ایک جاہل صوفی نے (مَنْ ذَاالَّذِیْ یَشْفَعُ) ''کون ہے وہ شخص جو سفارش کرے'' کے معنی اس طرح کیے ہیں کہ جس نے اس کو یعنی نفس کو ذلیل کیا وہ شفا پا گیا مَنْ کو بجائے استفہام کے موصولہ لیا اور ذل کو قطع نظر رسم خط سے بمعنی اذل لیا اور ذی کو اسم اشارہ مؤنث بنایا اور یشفع مضارع جو من کی جزاء ہے اور ع کو بمعنی ع صیغہ امر بمعنی احفظ لیا الٰہی توبہ کچھ حد ہے تحریف کی۔ اور ایک صاحب نے (والضحیٰ واللیل اذا سجیٰ) ''قسم ہے دن کی روشنی کی اور رات کی جبکہ وہ قرار پکڑے'' کے معنی اس طرح کیے۔ اے نفس تیری یہی سجا (سزا) ہے۔ معلوم نہیں نفس کس لفظ کے معنی ہیں شاید لیل سے سمجھا ہو کیونکہ وہ کالی ہوتی ہے اور نفس بھی سیاہ ہوتا ہے یعنی گناہوں کی سیاہی میں ملوث ہوتا ہے اور اذا میں جو ذا ہے اس کو اسم اشارہ سمجھا ہو جس کا ترجمہ ہے، یہی ایک فقیر نے ہمارے ماموں صاحب سے دریافت کیا کہ بتلاؤ رزق بڑا ہے یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم؟ انہوں نے کہا کہ حضور ﷺ ہی بڑے ہیں۔ کہنے لگے بے پیرا معلوم ہوتا ہے، پھر خود ہی بیان کیا کہ دیکھو اذان میں (اشھد ان محمداً رسول اللّٰہ) ''گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں'' میں ان پہلے ہے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پیچھے اس لیے ان بڑا ہے اور ان کہتے ہیں ہندی میں اناج کو (نعوذباللہ من ھذا الکفریات) یہ نکتے کہلاتے ہیں فقیری کے، کوئی اس جاہل سے پوچھے کہ ان کے معنیٰ اناج کے کدھر سے ہیں۔ کیا آذان میں ہندی لغت ہے؟ اور کیا تقدیم ذکری افضلیت کی علت ہے۔ خدا بچاوے اس جہالت سے ایسے ہی جاہلوں نے صوفیوں کو بدنام کیا ہے مگر اس سے علماء ظاہر کو سب صوفیوں پر ملامت کرنے کا حق نہیں ہوسکتا کیونکہ میں کہتا ہوں کہ آپ کی جماعت میں بھی تو ایسے جاہل موجود ہیں جو اس قسم کی ہزلیات (۱) بکتے ہیں۔

جاہل واعظین

چنانچہ ایک شخص نے وعظ کہا اور (انا اعطینک الکوثر) ''ہم نے آپ کو کوثر عطا کی'' کا یہ ترجمہ کیا کہ ہم نے تجھ کو کوثر کی مانند دیا ہے۔ کسی نے دریافت کیا کہ مانند کس لفظ کے معنی ہیں تو جواب دیا کہ ایک کاف تشبیہ کا ہوتا ہے اس کے معنی مانند کے

(۱) بے ہودہ باتیں۔

آتے ہیں اور یہ علم نحو کی بات ہے اس نے کہا کہ کاف تشبیہ کا تو گول لکھا ہوا ہوتا ہے یہ تو لمبا لکھا ہے۔ (واقعی جاہل کو سمجھانے کے لیے خوب طریقہ اختیار کیا) اس پر جواب دیا کہ ہم کو یہ بات معلوم نہیں تھی غنیمت ہے کہیں تو لاعلمی کا اقرار کیا ورنہ آج کل تو اس کا بھی کوئی جواب گھڑ دیتے ۔ پس جب ایسے جاہل واعظوں کے قصوں کی وجہ سے محقق علماء کو نہیں چھوڑا جاتا تو اسی طرح جاہل صوفیوں کی وجہ سے محقق صوفیوں کو بھی نہ چھوڑا جاوے گا۔ یہ مضمون اس پر چلا تھا کہ بعض جاہل صوفیوں نے اس حدیث کے معنی میں تحریف کی ہے حق تعالیٰ ان بندوں پر خوش ہوتے ہیں جو زنجیروں اور بیڑیوں میں جکڑ کر جنت میں بھیجے جاتے ہیں اور میں اس سے پہلے یہ بیان کر رہا تھا کہ حق تعالیٰ کی کتنی عجیب رحمت ہے کہ طالب تو طالب وہ غیر طالب بلکہ معرض (۱) روگرداں پر بھی توجہ فرماتے ہیں کہ ان کو بھی زبردستی جنت میں بھیج دیا جاوے گا یعنی ان کو خدا کی رحمت سے اسلام کی توفیق ہو جاتی ہے جیسے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ گئے تو تھے کیا ارادہ کر کے اور وہاں پہنچ کر مسلمان ہو گئے۔

مسلمانوں پر رحمت خداوندی

اس جگہ ایک ضروری بات یاد آ گئی اور وہ یہ کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس واقعہ سے مسلمانوں پر دنیا میں بھی حق تعالیٰ کی رحم کا اندازہ ہوتا ہے کیونکہ اسلام پر اس کے برکات مادیہ وروحانیہ یہ سب دنیا ہی میں عطا ہوئے اور آخرت کے برکات جدا رہے پھر بھی افسوس ہے کہ بہت لوگ یوں کہتے ہیں کہ دنیا میں کفار پر رحمت زیادہ ہے واللہ یہ بالکل غلط ہے۔ خدا کی قسم پھر خدا کی قسم پھر خدا کی قسم دنیا میں بھی مسلمانوں ہی پر زیادہ رحمت ہے اور دلیل اس کی یہ آیت ہے کہ حق سبحانہ وتعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿ فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ ۭ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ﴾ (۲) یعنی کفار کو مال واولاد اس واسطے دیا ہے کہ ان کو دنیا میں عذاب دینا منظور ہے کیونکہ خدا تعالیٰ نے کفار کو جیسے اولاد ومال زیادہ دیا ہے ویسے ہی ان کو ان اشیاء کی محبت بھی زیادہ دی ہے جس کی وجہ سے ہر دم وہ اس اُدھیڑ بن (۳) میں لگے رہتے ہیں کہ اولاد کس طرح ہو مال کیسے بڑھے نفع کس طرح حاصل ہو

(۱) اعراض اور بے التفاتی کرنے والے پر ہی توجہ فرماتے ہیں (۲) سورۃ التوبہ: ۵۵ (۳) سوچ بچار۔

اور اس فکر کی وجہ سے کسی وقت ان کو چین اور راحت نصیب نہیں ہوتی اور رحمت کا اثر دراصل راحت اور چین ہی ہے اور وہ اگر میسر ہے تو مسلمانوں کو میسر ہے یہ دوسری بات ہے کہ ان میں باہم تفاوت ہو۔

اہل اللہ کے برابر کسی کو چین میسر نہیں

کہ ادنیٰ مسلمان کو ادنیٰ درجہ کی راحت اور اعلیٰ درجہ کے مسلمانوں کو اعلیٰ درجہ کی راحت، باقی کفار کے مقابلہ میں عموماً سب مسلمان راحت میں ہیں کیونکہ وہ طالب آخرت ہیں اور کفار طالب دنیا ہیں اور دنیا کی یہ حالت ہے:

گر گریزی بر امید راحتے ہم از آنجا پیشت آید آفتے(۱)

دنیا کی کوئی چیز آفت سے خالی نہیں پھر اس طالب دنیا کو راحت کہاں اور آخرت کی یہ شان ہے

ہیچ کنجے بے دَو وبے دام نیست جز بخلوت گاہ حق آرام نیست(۲)

خلوت گاہ حق طلب آخرت ہی تو ہے کہ لقاء حق کا سامان کرے اور اس کے بعد علاوہ دلیل کے میں مشاہدہ کراتا ہوں اور ایک نظیر بتلاتا ہوں وہ یہ کہ دنیا میں اہل اللہ تو موجود ہیں ان کو دیکھ لو کس حال میں ہیں ان کا حال دیکھ کر یہ کہو گے:

ہنوز آں ابر رحمت در فشانست خم و خمخانہ با مہرو نشانست(۳)

نبوت تو ختم ہوگئی ہے مگر ولایت تو ختم نہیں ہوئی اہل اللہ اس وقت بھی موجود ہیں تجربہ کرلو تم چند روز اہل اللہ کی صحبت میں رہو اور طالبات دنیا کی صحبت میں بھی رہو اور دونوں جگہ محرم راز(۴) بن کر رہو جس سے صحیح حالات دونوں جگہ کے معلوم ہوسکیں۔ واللہ معلوم ہوجاوے گا کہ راحت اور چین اہل اللہ ہی کو نصیب ہے۔ اس سے زیادہ کیا دلیل لاؤں اگر مشاہدہ غلط ہوگا تو آکر ہاتھ پکڑ لینا مگر قبل تجربہ کے اعتراض کا حق نہیں اور میں اس کا راز بھی کھولے دیتا ہوں کہ اہل اللہ کو سب سے زیادہ راحت کیوں ہے وہ یہ کہ غم ہوتا ہے خلاف توقع سے اور اہل اللہ نے توقع ہی کو قطع کردیا ہے یعنی وہ دنیا کی کسی

(۱) ''اگر کسی راحت کی امید پر بھاگتا ہے تو اس جگہ بھی تجھ کو کوئی آفت پیش آئے گی'' (۲) ''کوئی گوشہ بے دوڑ دھوپ اور بغیر دام کے نہیں ہے سوائے خلوت گاہ حق کے آرام نہیں ہے'' (۳) ''اب بھی وہ ابر رحمت درفشاں ہے خم اور خم خانہ مہر ونشاں کے ساتھ موجود ہے'' (۴) راز داں۔

چیز سے توقع کو وابستہ نہیں کرتے اور نہ کسی معاملہ میں ان کی کوئی تجویز ہوتی ہے بلکہ وہ ہر معاملہ میں وہی چاہتے ہیں جو حق تعالیٰ چاہتے ہیں تم بھی حق تعالیٰ سے تعلق پیدا کرلو تو تمہاری سب خواہشیں اس کی مشیت میں فنا ہوجاویں گی۔ پھر یہ حال ہوگا کہ

ہرچہ آن خسرو کند شیریں بود[1]

جب تفویض ہوئی تو یہ حالت ہوجاوے گی۔

ناخوش تو خوش بود برجان من   دل فدائے یار دل رنجان من[2]

اور یوں کہوگے:

زندہ کنی عطائے تو وربکشی فدائے تو   دل شدہ مبتلائے تو ہرچہ کنی رضائے تو[3]

غرض غم ان کے پاس نہیں پھٹکتا۔

اہل اللہ کے غمگین نہ ہونے کا راز

اور ایک لطیفہ اور بھی بتلاتا ہوں وہ یہ کہ اگر کسی وقت ان کو غم ہی کا مراد حق[4] ہونا معلوم ہوجاوے تو پھر وہ غم ہی میں مشغول ہوجاتے ہیں کیونکہ اصل مقصود تو رضا وقرب ہے[5] نہ خوشی مقصود ہے نہ غم مقصود ہے اس لیے جب وہ دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو ہمارا غمگین ہونا ہی مطلوب ہے تو اس وقت غمگین بن جاتے ہیں اور غم ظاہر کرتے ہیں مگر ماتم نہیں کرتے بلکہ کبھی چہرہ سے کبھی کسی بات سے غم ظاہر ہوجاتا ہے باقی اہتمام اظہار غم کا نہیں کرتے کیونکہ اظہار غم کا اہتمام کرنا شرعاً ممنوع ہے اور وہ غم ہی کیا ہوا جس کے ظاہر کرنے کے واسطے اہتمام کیا جاوے وہ تو تصنع اور بناوٹ ہوگی۔ غم تو وہ ہے جو خود بخود اضطراراً ظاہر[6] ہو اس تصنع پر ایک خادمہ کی حکایت یاد آگئی جو ہمارے گھر نوکر تھی اور یہاں سے پہلے ایک شیعی نواب کے یہاں رہتی تھی وہ ایک بار ماتم میں شریک ہوئی۔ تھوڑا سا ماتم کرکے شیرینی تقسیم ہوتی تھی ایک بار تقسیم میں اس کو بھول گئے اس کو

(۱) ''جو کچھ بادشاہ کرتا ہے وہی خوشگوار ہوتا ہے'' (۲) ''میری جان پر خوش اور پسندیدہ ہے میں اپنے یار پر جو میری جان کو رنج دینے والا ہے اپنے دل کو قربان کرتا ہوں'' (۳) ''زندہ کریں آپ کی عطا ہے اور اگر قتل کریں آپ پر قربان ہوں، دل آپ پر فریفتہ ہے جو کچھ کریں آپ پر راضی ہوں'' (۴) اگر کسی وقت معلوم ہو کہ اس کو ہمارا غمگین ہونا مطلوب ہے (۵) اللہ کی رضامندی اور قرب ہے (۶) غیر اختیاری طور پر۔

شیرینی میں حصہ نہ ملا اس کے بعد پھر ماتم شروع ہوا، ہائے حسن ہائے حسین، اس نے بجائے ماتم کے ہائے جلیبی ہائے رکابی (۱) کہنا شروع کیا۔ عورتوں کو معلوم ہوا کہ اس کو جلیبی نہیں ملی تو اس کو بھی حصہ دیا گیا۔ اس بیچاری نے ظاہر کر دیا کہ اصل تو جلیبی تھی نہ کہ ماتم اوروں نے گو ظاہر نہ کیا ہو مگر مقصود سب کا مٹھائی ہی ہوتی ہے جس کا امتحان ہوسکتا ہے کہ ماتم میں شیرینی تقسیم نہ کرو پھر دیکھو کتنے آدمی آتے ہیں۔ بس گویا ان کے مذاق پر ایک رکابی اور چار جلیبی مل کر پنجتن ہو جاتے ہیں ورنہ کچھ بھی نہیں۔ یہ حقیقت ہے ماتم کی پھر اس کو دین کہا جاتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ جس غم کے اظہار کا اہتمام ہو وہ تو تصنع ہے (۲) جیسا اس قصہ میں مذکور ہوا لیکن اللہ والے اس غم کا اظہار بھی نہیں کرتے اس میں بھی وہ خوش ہی ہیں اور غم کے وقت بھی صرف اس لیے طبعاً غمگین ہوتے ہیں کہ محبوب کو انہیں غمگین دیکھنا منظور ہے باقی اندرون دل سے عقلاً وہ اس وقت بھی رضا کے ساتھ مسرور ہوتے ہیں اور سچ تو یہ ہے اہل اللہ نے جو چیز دیکھی ہے اس کے ہوتے ہوئے ہر حال میں ان کا خوش رہنا کیا کمال ہے، خدا کا احسان مانو جس نے یہ حقائق منکشف کیے اور یہ مقام عطا فرمائے۔

منت منہ کہ خدمت سلطان ہمی کند منت شناس از و کہ بخدمت بداشت (۳)

الغرض دنیا میں مؤمنین پر جتنی رحمت ہے اس کا کوئی جزو بھی کفار پر نہیں چنانچہ اس واقعہ احد سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کو مسلمانوں کی راحت کا کس درجہ اہتمام ہے کہ اول ''لقد عفا اللہ عنہم'' (اللہ تعالیٰ نے ان کو معاف کر دیا) فرما چکے ہیں جس سے آخرت کی طرف ان کو بے فکر کر دیا گیا کہ تم سے وہاں گرفت نہ ہوگی۔ اس کے بعد ان کی دنیا کی راحت کا سامان فرماتے ہیں کیونکہ اگر صرف آخرت ہی میں مسلمانوں پر رحمت فرما دیتے تو یہی کافی تھی۔ عفا اللہ عنہم (اللہ تعالیٰ نے ان کو معاف کر دیا) فرما دینا بلکہ اس جگہ اس کی اطلاع دینے کی بھی ضرورت نہ تھی جب آخرت میں پہنچتے وہاں رحمت فرما دیتے مگر اس پر بس نہیں کیا گیا بلکہ دنیا میں بھی ان کو اس طرح راحت پہنچائی کہ حضور ﷺ کا انقباض جو صحابہؓ کے لئے موجب کوفت تھا (۴) اس کے ازالہ کا بھی اہتمام کیا

(۱) ہائے جلیبی ہائے پلیٹ کہنا شروع کر دیا (۲) بناوٹ (۳) ''احسان مت جتاؤ کہ ہم بادشاہوں کی خدمت کرتے ہیں بلکہ احسان مانو کہ تم جیسے نااہلوں کو اس نے خدمت میں رکھ چھوڑا ہے'' (۴) باعث پریشانی۔

گیا۔ اگر حق تعالیٰ کو دنیا میں مسلمانوں کو راحت دینا منظور نہ تھا تو یہ اہتمام کیوں کیا گیا۔ اگر اس راحت دنیوی پر کسی کو شبہ ہو کہ افلاس وغیرہ تو اہل اللہ کو بھی ہوتا ہے پھر اہل اللہ سے غم کی نفی کیسے صحیح ہے۔

اسباب راحت

اس کا جواب یہ ہے کہ دراصل یہ اسباب غم ہیں عین غم نہیں اس میں لوگوں کو بہت خلط (۱) ہو رہا ہے کہ اسباب کو عین مسبب سمجھتے ہیں اسی طرح یہ بھی سمجھو کہ راحت اور ہے اور اسباب راحت اور۔ پس یہ ضروری نہیں کہ جہاں اسباب غم موجود ہوں وہاں غم بھی موجود ہو۔ مثلاً کسی کو ان کا محبوب زور سے دباوے کہ ہڈیاں بھی ٹوٹنے لگیں مگر ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہو کہ محبوب دبا رہا ہے تو گو سبب موجود ہے مگر غم اصلاً موجود نہ ہوگا بلکہ شوق میں یہ کہا جاوے گا:

سر بوقت ذبح اپنا اس کے زیر پائے ہے کیا نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

بلکہ اس وقت اگر محبوب یہ بھی کہے کہ تم کو تکلیف ہوتی ہو تو لاؤ تم کو چھوڑ کر رقیب کو دبانے لگوں تو اس وقت یوں کہے گا:

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی (۲)

بس معلوم ہو گیا کہ دبانا عین تکلیف نہ تھا بلکہ اسباب تکلیف میں سے تھا۔ چنانچہ جب معلوم ہو گیا کہ دبانے والا محبوب ہے تو سب تکلیف جاتی رہی بلکہ اب سبب راحت بن گیا۔ اسی طرح اہل اللہ کے ظاہری مصائب کو سمجھو۔ پس ثابت ہو گیا کہ یہ اسباب ہیں غم کے خود غم نہیں اور اہل اللہ سے ہم غم کی نفی کرتے ہیں اسباب غم کی نفی نہیں کرتے خوب سمجھ لو مگر ان اسباب کے ساتھ بھی اہل اللہ سے غم منتفی ہے کیونکہ اہل اللہ جانتے ہیں کہ یہ سب کچھ ان کے محبوب حقیقی کا تجویز کردہ ہے تو اس تصور سے سارا غم ڈھل جاتا ہے۔ شروع میں تو یہ بات عقلی ہی ہوتی ہے مگر آخر میں طبعی بن جاتی ہے۔ اگر کوئی یہ سوال کرے کہ جب اہل اللہ خدا تعالیٰ کے خاص بندے ہیں محبّ و عاشق ہیں تو ان کو یہ تکلیف کیوں دی جاتی

(۱) مغالطہ ہوتا ہے (۲) ''دشمن کا ایسا نصیب نہ ہو کہ تیری تلوار سے ہلاک ہو دوستوں کا سر سلامت رہے کہ تو خنجر آزمائی کرے''۔

ہے اور اہل اللہ کو تکلیف میں لذت کس طرح حاصل ہوتی ہے یہ تو کچھ کمال نہ ہوا بلکہ بے حسی معلوم ہوتی ہے تو اس سائل سے میں پوچھتا ہوں کہ محبوبان دنیا جو اپنے عشاق سے ناز و انداز کرتے ہیں ان میں کیا حکمتیں ہیں اور عشاق کو ان میں لذت کیوں آتی ہے محبوب کے چپت مارنے میں لذت کیوں ہے عاشق کو اس سے کیا نفع ہوا کچھ نہیں۔

محبت کا خاصہ

بس یہی کہا جاوے گا کہ محبت کا خاصہ ہے کہ محبوب عشاق کو آزمایا بھی کرتے ہیں ان سے ناز و انداز بھی کیا کرتے ہیں اور عشاق کو اس میں لذت بھی آتی ہے اگر اس کا نام بے حسی ہے تو ساری دنیا بے حس ہے کیونکہ محبت سے کوئی خالی نہیں خواہ کسی سے ہو۔ غرض اہل اللہ کی راحت کا راز یہ ہے کہ انہوں نے اپنی تجویز کو فنا کر دیا ہے۔ بس ایسے لوگ دنیا میں بھی راحت سے ہیں جو اپنی تجاویز کو حق سبحانہ کے سامنے فنا کر چکے ہیں۔ اسی ازالہ غم کے لیے تو حق جل جلالہ نے وَ لَنَبْلُوَنَّكُم الخ ''ہم تمہاری ضرور آزمائش کریں گے'' کے بعد اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْن ''ہم اللہ ہی کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں'' کا مراقبہ تعلیم فرمایا ہے یعنی جب کوئی غم کی بات ہو تو کہو کہ ہم اللہ کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں وہ مالک ہیں ایک مقدمہ تو یہ ہوا دوسرا مقدمہ مطوی ہے (۱) کیونکہ ایک مقدمہ منتج (۲) نہیں ہوتا گو آج کل کے بعض عقلاء قائل ہوئے ہیں کہ ایک مقدمہ بھی منتج ہے اور مطوی ماننا تکلف ہے مگر صحیح یہی ہے کہ نتیجہ مقدمتین سے حاصل ہوتا ہے اور ایسے مقام پر کہ جہاں بظاہر ایک ہی مقدمہ منتج معلوم ہوتا ہے دوسرا مقدمہ مطوی ہوتا ہے یہاں یہ مانا جاوے گا کہ وہ مالک ہونے کے سبب تصرف کا حق رکھتا ہے تو پھر تم کو چون و چرا کا کیا حق ہے۔ یہ عقلی مراقبہ تھا اور وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْن ''ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں'' میں طبعی مراقبہ ہے اور اس میں دو مرتبے ہیں ایک عشاق کی نظر میں ہے کہ جب خدا مل گیا تو پھر غم کیسا اور ہم کو دوسری وجہ سے اس مراقبہ میں تسلی ہوئی یعنی یہ سمجھ کر کہ وہاں لوٹ کر سب مل جاویں گے۔ اس عالم میں

(۱) پوشیدہ (۲) ایک مقدمہ سے نتیجہ نہیں نکل پاتا۔

ہم اور یہ مفقود جس کے فقدان کا رنج ہے باہم مجتمع ہوجاویں گے۔ سبحان اللہ قرآن کی بھی کیا شان ہے کہ اس سے ہر شخص کو اس کے درجہ کے موافق تسلی ہوتی ہے۔ ایسے جامع الفاظ میں جن سے عوام بھی تسلی حاصل کریں اور خواص بھی ؎

تسلی داد ہر یک را برنگے (۱)

بس قرآن مجید کی شان یہ ہے:

بہار عالم حسنش دل و جاں تازہ میدارد برنگ اصحاب صورت را بہوار باب معنی را (۲)

چنانچہ اسی ''اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْن'' سے عشاق نے تو یوں سمجھا کہ عالم آخرت میں ہم کو اللہ تعالیٰ ملے گا، بیوی نہ رہی نہ سہی اور عوام نے یہ سمجھا کہ وہاں یہ بیوی بھی مل جاوے گی اور اس کے سوا اور بھی بہت کچھ ملے گا، اپنے مذاق اور مرتبہ کے موافق تسلی سب کی ہوگئی۔ بس جب عامہ مؤمنین کو بھی مغموم نہیں رکھتے بلکہ اگر کبھی انہیں کی مصلحت سے جوان کو تکلیف پہنچائی جاتی ہے تو اس میں تسلی کی تدابیر بتلاتے ہیں تو صحابہؓ کو کیسے مغموم چھوڑ دیتے تمہید لمبی ہوگئی مگر کچھ حرج نہیں مفید مضامین آگئے ہیں اور وہ سب ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے افراد ہیں۔ گو اس وقت آپ کا ذکر بواسطہ مقصود تھا مگر الحمدللہ بلاواسطہ بھی ہوگیا۔

شان صحابہؓ

کیونکہ آیت میں خاص رسول اللہ ﷺ کے معاملات صحابہؓ کے ساتھ مذکور ہیں جن کا حاصل یہ ہے کہ اس واقعہ میں صحابہ کی لغزش پر تنبیہ کردینے کے بعد صحابہؓ کا غم دور کرنے کے لیے حضور ﷺ کو ایک خاص ارشاد ہے: عفو واستغفار للصحابہؓ (۳) کا اور اس سے پہلے فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ''بعد اس کے خدا ہی کی رحمت کے سبب آپ ان کے ساتھ نرم رہے'' اس کی تمہید ہے کیونکہ صحابہؓ کو اور تو کوئی غم نہ رہا تھا سب سے حق تعالیٰ نے تشفی کردی تھی اب صرف ایک غم باقی رہ گیا تھا کہ حضور ﷺ ناراض ہیں اس لیے حق تعالیٰ آپ کو ارشاد فرماتے ہیں:

(۱) ''ہر ایک کو ایک طریقے سے تسلی دی'' (۲) ''اس عالم حسن کی بہار ظاہر پرستوں کے دل وجاں کو رنگ سے اور حقیقت پرستوں کے دل وجاں کو بو سے تازہ رکھتی ہے'' (۳) صحابہ کے لیے عفو واستغفار کا۔

(فَاعْفُ عَنْهُمْ) ''تو آپ ان کو معاف کر دیجئے تو دیکھنا یہ ہے کہ اس مضمون کو کس طرح فرماتے ہیں یعنی فقط (فَاعْفُ عَنْهُمْ) ''آپ ان کو معاف کر دیجئے'' نہیں فرمایا بلکہ اس کے پیشتر ایک تمہید بیان فرمائی جس سے آپ کی جمالت رحمت اور جلالت نبوت کی خاص شان معلوم ہوتی ہے کیونکہ بدون اس تمہید کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طبعی انقباض زائل ہونا دشوار تھا اس لیے اول ارشاد فرمایا (فَبِمَا رَحْمَةٍ) ''رحمت کے سبب'' کہ آپ اپنے لین وشان رحمت کو دیکھئے پھر اس کے ساتھ (مِنَ اللّٰه) یعنی اللہ ہی کی رحمت کے سبب، بڑھایا کہ یہ رحمت حق تعالیٰ نے آپ کے اندر رکھی ہے جس سے معلوم ہوا کہ بہت بڑے درجہ کی رحمت ہے پھر مصلحت اس رحمت کی بیان فرمائی ہے کہ آپ کو نرم اس واسطے بنایا کہ اگر آپ فظ ہوتے یعنی ظاہر میں سخت کلام ہوتے (غَلِيْظَ الْقَلْبِ) یعنی اگر آپ دل کے بھی سخت ہوتے تو نتیجہ یہ ہوتا (لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ) یعنی صحابہؓ آپ کے پاس سے چلے جاتے۔ ان ارشادات کے بعد کہ جو متضمن ہیں خاص مراقبات کو طبعی انقباض بھی نہیں رہ سکتا۔ پس صحابہؓ کا ہر قسم کا غم دور کر دیا گیا اور یہ مقام ایک خاص مسئلہ میں مزال اقدام ہے (قدموں کے پھسلنے کی جگہ) مشائخ مبطلین کے واسطے انہوں نے اس سے یہ سمجھا کہ اپنے ساتھ لوگوں کو لگائے لپٹائے رکھنا، خوب مطلوب شرعی ہے اور اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان لین کا اثبات بقصد امر اور فظاظت وغلظت (۱) کی نفی بقصد نہیں مذکور ہوئی ہے تو انہوں نے مجمع کی دلجوئی کے لیے نرمی اور شفقت ہی کو لے لیا اور دارو گیر ودرشتی کو بالکل چھوڑ دیا اور جو مصلح ایسا کرے اس پر ملامت وطعن کرتے ہیں لیکن مشائخ محققین اس غلطی میں نہیں پڑتے وہ کلام کی حقیقت کو سمجھ گئے اسی لیے وہ معتدل ہوتے ہیں کہ نرمی کی جگہ نرم اور سختی کی جگہ سخت کیونکہ وہ دیکھتے ہیں کہ جہاں جنگ احد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ امر ہے وہاں جنگ احد کے بعد جس میں حضور ﷺ کو (فَاعْفُ عَنْهُمْ) ''آپ ان کو معاف کر دیجئے'' کا امر ہوا تھا۔

غزوہ تبوک اور واقعہ کعب بن مالکؓ

تبوک میں جو جنگ (۲) سے بہت مؤخر ہے۔ یہ واقعہ ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم

(۱) دارو گیر اور درشتی یعنی سختی (۲) جنگ احد۔

نے تمام شہر کے مسلمانوں کو منع فرمایا کہ کعب بن مالک اور ہلال بن امیہ اور مرارہ بن الربیع سے نہ بولیں کیونکہ یہ حضرات بدون کسی عذر قوی کے غزوہ تبوک سے متخلف رہے تھے (۱) جس میں شرکت کا سب کو امر ہوا تھا (۲) پھر پچاس روز تک یہ حکم رہا۔ اس عتاب سے ان حضرات کی یہ حالت ہوگئی تھی کہ جس کو قرآن شریف میں بھی اس طرح بیان فرمایا گیا ہے: ﴿وَضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَارَحُبَتْ﴾ (۳) یعنی ان کو زمین تنگ نظر آتی تھی (باوجود وسعت کے) کوئی دوسرا شخص یہ حالت بیان کرتا تو غالباً مبالغہ پر محمول کیا جاتا مگر جب خود خدا تعالیٰ نے ان کی یہ حالت بیان فرمائی ہے تو اندازہ کرلو کہ ان حضرات پر کیا گزرتی ہوگی اور خطا صرف یہ تھی کہ جنگ تبوک میں شریک نہ ہوئے تھے کچھ منافقین بھی پیچھے رہ گئے تھے مگر وہ تو بہانہ کرکے بچ گئے اور ان تین حضرات نے صاف صاف عرض کردیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم دراصل ہم کو کوئی عذر نہیں تھا، تخلف کے باعث محض سستی تھی اس پر ان کا مقدمہ ملتوی کیا گیا تھا اور مسلمانوں کو ان سے کلام وسلام قطع کرنے (۴) کا حکم ہوا تھا۔ اسی زمانہ میں حضرت کعب کے پاس ایک نصرانی بادشاہ کا خط آیا کہ ہم کو معلوم ہوا کہ تمہارے آقا نے تمہارے ساتھ بہت بے قدری کا برتاؤ کیا تم یہاں چلے آؤ ہم تمہاری بہت عزت کریں گے۔ غرض یہ کہ ابتلاء پر ابتلاء ہوا کس قدر سخت امتحان تھا۔

بیم سر یا بیم جاں یا بیم دیں امتحانے نیست مارا مثل ایں (۵)

مگر ان کی ہمت کہ جواب تک نہیں دیا بلکہ اس کو پڑھتے ہی ایک تنور میں جو قریب تھا فوراً جھونک دیا۔ گو بزبان حال قاصد سے یہ کہا کہ

آنست جوابش کہ جوابش ندہم (۶)

حضور ﷺ کو اس خط کی اطلاع ہوئی مگر اس واقعہ پر بھی آنحضرت ﷺ نے اپنی رائے مبارک نہیں بدلی کیونکہ وہاں تو سب کام حکم سے تھا وہاں حکم کے سامنے کوئی پرواہ نہیں تھی کہ کوئی بگڑ جاویگا یا کوئی مخالف ہوجاوے گا اس دربار کی تو یہ شان ہے:

ہر کہ خواہد گو بیاید ہر کہ خواہد گو برو دارو گیر وحاجب ودرباں دریں درگاہ نیست (۷)

(۱) غزوہ تبوک میں شریک نہ ہوسکے (۲) حکم ہوا تھا (۳) التوبۃ: ۹/ ۲۵ (۴) بند کرنے کا (۵) ''سر کا خوف جان کا ڈر، دین کا خطرہ ہمارے لیے اس کی مثل کوئی امتحان نہیں ہے'' (۶) ''اسکا جواب یہ ہے کہ اس کو میں جواب نہ دوں'' (۷) ''جو آنا چاہے آجائے جو جانا چاہے چلا جائے، اس دربار میں چوبدار، چوکیدار، دارو گیر نہیں ہیں''۔

وہاں احسان کس پر تھا کسی کو ہزار غرض ہو تو دربار میں ناک رگڑے، رسول اللہ ﷺ کو خدا کافی تھا۔ حضور ﷺ صحابہؓ کے محتاج نہ تھے اس لیے آپ نے اس کی کچھ پرواہ نہ کی ان کو ایک دشمن بلا رہا ہے لاؤ میں ان کے ساتھ کچھ نرمی کروں، ہرگز نہیں۔ جب پورے پچاس دن ہو چکے تب آیت نازل ہوئی اور حضرت کعب بن مالک کہتے ہیں جیسا حدیث میں آیا ہے کہ بڑا غم یہ تھا کہ خدانخواستہ اگر حضور ﷺ اسی حالت میں اس عالم سے تشریف لے گئے تو بعد میں میرا کیا حال ہوگا کیونکہ جانتے تھے کہ حضور ﷺ کے جانثار صحابہؓ حکم کے خلاف ہرگز نہ کریں گے تو بس ساری عمر کو مسلمانوں سے بول چال بند رہے گی اور اب تو تبدیل حکم کی امید بھی ہے کہ وحی آجاوے پھر تو یہ احتمال بھی منقطع ہوجاوے گا اور اگر میرا انتقال اسی حال میں ہوگیا تو حضور ﷺ میرے جنازہ کی نماز نہ پڑھیں گے۔

نیز ان کے لیے زیادتی غم کی ایک اور وجہ یہ تھی کہ وہ دونوں ساتھی تو بوڑھے تھے وہ تو گھر میں بیٹھ رہے جس سے ایک قسم کی یکسوئی ہوگئی اور یہ مسجد نبوی ﷺ میں نماز کے لیے حاضر ہوتے تھے اور جب حضور ﷺ ان کو دیکھ کر نظر پھیر لیتے تھے تو ان پر کیا گزرتی ہوگی۔ مگر یہ کن انکھیوں سے دیکھتے رہتے تھے کہ حضور ﷺ مجھ کو دیکھتے ہیں یا نہیں؟ وہ فرماتے ہیں کہ میں حضور ﷺ کے قریب نماز پڑھا کرتا جب نماز کی طرف متوجہ ہوتا تو حضور ﷺ مجھ کو دیکھا کرتے تھے اور جب میں آپ کو دیکھتا تو آپ نظر ہٹا لیتے تو اصول عشق سے عجب نہیں کہ جب یہ دیکھتے کہ حضور ﷺ ان کی طرف دیکھ رہے ہیں تو یہ حضور ﷺ کی طرف دیکھنا موقوف کردیتے ہوں کیونکہ اگر یہ بھی دیکھتے رہتے تو حضور ﷺ عادت کے موافق اپنی نظر ہٹا لیتے اور یہ بھی ایک محبوبانہ انداز تھا:

خوبی ہمیں کرشمہ ناز وخرام نیست بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست (۱)

اور حضرت کعب اصول عشق سے اپنے دیکھنے سے زیادہ حضور ﷺ کے دیکھنے کو لذیذ سمجھتے ہوں گے اس لیے خود نہ دیکھتے ہوں گے جس کو محبت کا چسکا لگا ہے اس کے مزہ کو وہی جانتا ہے۔

(۱) ''حسن اسی ناز وخرام اور کرشمہ کا نام نہیں ہے حسینوں کی بہت ادائیں ایسی ہیں جن کا نام نہیں ہے''۔

ذوق این می نشناسی تابخدا بخشی(۱)

اصلاح میں نرمی اور سختی دونوں کی ضرورت ہے

الحمد للہ تھوڑی سی حس ہم کو بھی نصیب ہے اور یہ لذت کہ محبوب ان کو دیکھے گو یہ محبوب کو نہ دیکھیں کچھ عشاق کی گھڑت نہیں بلکہ اس کی اصل قرآن شریف میں موجود ہے۔ حضور ﷺ کو ارشاد ہے: ﴿وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا﴾(۲) کہ آپ اس لذت میں مشغول رہیئے کہ میں خدا کے سامنے ہوں وہ مجھ کو دیکھ رہے ہیں۔ حق تعالیٰ نے حضور ﷺ کو یہ مراقبہ بتلایا ہے کفار کی ایذاؤں پر صبر کے واسطے کہ اس سے آپ کا رنج کافور(۳) ہوجائے گا۔ صاحبو! صحیح مذاق قرآن شریف میں سب موجود ہے البتہ من گھڑت باتیں اس میں نہ ملیں گی۔ غرض کبھی اپنے محبوب کو دیکھنے میں لذت ہوتی ہے اور کبھی محبوب کے ان کو دیکھنے اور خود اِدھر نگاہ نہ کرنے میں لذت ہوتی ہے تاکہ وہ دیکھتا رہے۔ یہی حالت حضرت کعبؓ کی تھی اور اس سے معلوم ہوا کہ گو حضور ﷺ بظاہر ناراض تھے مگر دل سے ناراض نہ تھے بلکہ دل سے ان کی طرف توجہ تھی۔ اسی توجہ نے تو ان کو سنبھالا۔ حضرت کعبؓ یہ بھی فرماتے ہیں کہ میں حضور ﷺ کو سلام کرکے کن انکھیوں سے یہ بھی دیکھتا تھا کہ حضور ﷺ نے جواب کے لیے لبہائے مبارک کو حرکت دی یا نہیں؟

اب بتلایئے کیا یہ واقعات سیاست کے سنت رسول اللہ ﷺ نہیں؟ کیا ایسا برتاؤ کرنا آج جائز نہیں؟ یقیناً جائز ہے۔ پس محققین پر اعتراض کیوں کیا جاتا ہے اگر وہ اس کے موافق عمل کریں۔ آج کل لوگ کہتے ہیں کہ فلاں شخص سخت ہے حالانکہ وہ سختی نہیں اور اگر یہ سختی ہے تو میں کہوں گا ارے رسول اللہ ﷺ نے بھی تو ایسی سختی کی ہے بلکہ آخر عمل وہی ہے۔ یاد رکھو حضور ﷺ کا جہاں یہ کمال ہے کہ لین اور نرم مزاج تھے وہاں یہ بھی کمال تھا کہ حضور ﷺ سختی کے موقع پر سخت بھی تھے۔ کیا یہ بھی کوئی تعریف ہے کہ ڈاکٹر فقط مرہم رکھے اور کسی شخص کے باوجود ضرورت کے شگاف نہ دے ہرگز نہیں۔ اگر کوئی ڈاکٹر ہمیشہ ایسا کرے گا تو اس کے مریض ہلاک ہوں گے بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ مرہم کے موقع پر مرہم رکھو اور شگاف کے موقع پر شگاف دو تو جس طرح شگاف اور مرہم

(۱) ''اس شراب محبت کا ذوق بخدا جب تک نہ پیو نہیں جان سکتے'' (۲) الطور: ۵۲/ ۴۸ (۳) آپ کا غم دور ہوجائے گا۔

دونوں کی ضرورت ہے اسی طرح اصلاح میں نرمی اور سختی درکار ہیں۔ اسی بناء پر یہاں واقعہ تبوک میں اصلاح کے لیے سختی کی گئی اور وہاں واقعہ احد میں اصلاح کے بعد (فَاعْفُ عَنْهُمْ) (سو آپ ان کو معاف کر دیجئے) فرمایا۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ ﴿لَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ﴾ (۱) میں مبطلین کو غلطی ہوگئی کہ انہوں نے مطلقاً نرمی کو ضروری سمجھا تاکہ مجمع جمار ہے حالانکہ نرمی مطلقاً مطلوب نہیں ہے۔ جیسا کہ بیان کیا گیا اور جو مطلوب بھی ہے وہ نرمی نہیں جو ان لوگوں نے اختیار کی ہے۔

نرمی کی اقسام

اصل یہ ہے کہ نرمی کی دو قسمیں ہیں ایک نرمی تو وہ جو لوگوں کی دینی مصلحت سے ہو اور ایک نرمی وہ جو اپنی دنیوی مصلحت سے ہوتا کہ لوگ زیادہ معتقد ہوں یعنی جاہ (۲) زیادہ ہو، آمدنی زیادہ ہو تو یہ لوگ معتقدوں کا مجمع بڑھانے اور زیادہ آمدنی کے ہونے کی وجہ سے نرمی بلکہ بعض مرتبہ خوشامد تک اختیار کرتے ہیں اور نیت ملفوظی (۳) کے طور پر وجہ یہ گھڑتے ہیں کہ ان کو ہدایت ہوگی۔ اگر ہم سختی کریں گے تو وہ ہدایت سے محروم ہو جاویں گے۔ ذرا یہ پیر صاحب غور تو کریں کہ حضور ﷺ کے اس عالم سے تشریف لے جانے پر تو ہدایت بند نہ ہوئی، آپ سے تعلق موقوف ہونے (۴) پر بند ہو جاوے گی اور گو حضور ﷺ کے نائبین اور خدام جو دین کی خدمت کر رہے ہیں اس سے درحقیقت حضور ﷺ ہی کا فیض باقی ہے کیونکہ ان حضرات میں بھی حضور ﷺ کا فیض ہے جس سے مخلوق کو ہدایت ہو رہی ہے اور اب حضور ﷺ سے فیض لینے کی یہی صورت ہے کہ حضور ﷺ کے نائبین سے فیض حاصل کیا جائے۔ جیسا کہ مولانا فرماتے ہیں:

چونکہ گل رفت وگلستان شد خراب — بوئے گل را از کہ جویم جز گلاب
چونکہ شد خورشید دما را کرد داغ — چارہ نبود در مقامش از چراغ (۵)

(۱) ''اگر آپ تند خو اور سخت طبیعت ہوتے تو یہ آپ کے پاس سب لوگ منتشر ہو جاتے'' آل عمران: ۳/۱۵۹
(۲) اقتدار بڑھے (۳) اس میں نیت یہ بیان کرتے ہیں کہ ان کو فائدہ زیادہ ہوگا (۴) تعلق ختم ہونے پر (۵) ''موسم گل ختم ہو گیا اور چمن اُجڑ گیا، گلاب تو ہے نہیں جسے خوشبو حاصل ہو اب عرق گلاب سے اس کی بو حاصل کر لوں چوں کہ آفتاب چھپ گیا اور ہم کو داغ دے گیا اب اس کی جگہ چراغ ہی کافی ہے''۔

مگر ظاہر میں تو حضور ﷺ اس عالم سے تشریف لے ہی گئے اور پھر بھی ہدایت کا سلسلہ جاری ہے تو اے پیر کیا تیرے بغیر ہدایت گم ہوجائے گی ہرگز نہیں بس بیٹھ اپنا کام کر۔ بس تمہارا یہ کہنا کہ نرمی میں ہماری یہ نیت ہے کہ مخلوق کو ہدایت ہو محض لفظی نیت ہے قلبی نیت نہیں ہے۔

نیت کی حقیقت

نیت ملفوظی پر مجھے اپنا ایک واقعہ یاد آ گیا کہ ایک جگہ میں سفر میں تھا لوگوں نے مجھ سے نماز پڑھانے کی درخواست کی۔ میں نے عذر کیا کہ میں مسافر ہوں نماز میں قصر کروں گا اور عوام قصر کی وجہ سے گڑ بڑ میں پڑ جاتے ہیں اس لیے کوئی مقیم نماز پڑھاوے تو بہتر ہے۔ تو ایک صاحب نے اس وقت مجھے نیت اقامت کا مشورہ دیا کہ اقامت کی نیت کر لیجئے اور چار رکعت پڑھا دیجئے۔ میں نے کہا سبحان اللہ بھلا اس حالت میں کہ میں سواری کے لیے آدمی بھیج چکا اور ٹکٹ کے لیے دوسرا آدمی بھیج چکا ہوں اقامت کی نیت کس طرح کر سکتا ہوں اور اگر کروں گا تو وہ محض الفاظ ہی الفاظ ہوں گے نیت کدھر سے ہوجائے گی۔ بس ایسی ہی ہدایت کی نیت شیخ مبطل (۱) کی ہے کہ اس کے نزدیک اصل چیز تو مال یا جاہ ہے مانعۃ الخلو کے طور پر یعنی کہیں مال وجاہ دونوں مقصود ہوتے ہیں کہیں ایک مگر زبان سے نیت ہدایت اور اتباع سنت اور خوش خلقی کا دعویٰ ہے۔ شیخ جی صاحب! اول تو دنیا میں سارے بیوقوف نہیں بستے سب دھوکہ میں نہیں آسکتے۔ دوسرے تم کو تو اپنی حالت بخوبی معلوم ہے اگر تمام مخلوق دھوکہ میں آ گئی تاہم خدا سے تو مخفی نہیں (۲) اس کے سامنے کیا جواب دوگے۔ کیا وہاں بھی یہ تصنیفی وجہ (۳) چل سکتی ہے ہرگز نہیں، رہی نرمی کی دوسری وجہ جو شرعاً مطلوب ہے یعنی لوگوں کی دینی مصلحت سے نرمی اختیار کرنا وہ وجہ ہر موقع کے لیے عام نہیں ہوسکتی کیونکہ جہاں اصلاح کے واسطے سختی کی ضرورت ہے وہاں نرمی کرنے میں دوسروں کی کیا مصلحت ہے۔

مشائخ مبطلین کی غلطی کا منشاء

اب میں ان مشائخ مبطلین کی غلطی کا منشاء (۴) بتلاتا ہوں کہ اس آیت سے

(۱) اس پیر جاہل (۲) پوشیدہ نہیں (۳) منگھڑت وجہ (۴) جاہل پیروں کی غلطی کی وجہ۔

انہوں نے ہر حال میں نرمی کی ضرورت کس طرح سمجھی۔ بات یہ ہے کہ ترجمہ آیت سے یہ لوگ یوں سمجھے کہ مقصود بالکلام انفضاض کا انسداد ہے(۱) اور اس کے لیے لین کی ترغیب(۲) اور فظاظت وغلظت(۳) سے کی گئی ہے اس لیے یہ نتیجہ نکال لیا کہ ہر حال میں نرمی کرنا چاہیے تا کہ لوگ مجتمع رہیں حالانکہ یہ سب بناء الفاسد علی الفاسد ہے(۴)۔ آیت کا یہ مدلول(۵) ہی نہیں کہ اجتماع خلق(۶) مقصود ہے اور اس کے لیے حضور ﷺ کو نرمی کا حکم ہے اگر یہ مطلب ہوتا تو اجتماع خلق مقصود ہوتا تو ابن اُم مکتوم کے واقعہ میں حضور ﷺ پر عتاب کیوں ہوتا حالانکہ اس وقت حضور ﷺ سرداران قریش کو دعوت اسلام دے رہے تھے جن کے مسلمان ہوجانے سے مجمع کی زیادت وقوت کی توقع تھی اسی وقت ابن ام مکتوم نابینا صحابی آ گئے اور کچھ دریافت کیا حضور ﷺ کو کسی قدر ان کا سوال گراں ہوا اس پر سورہ عبس نازل ہوئی جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مجمع کا بڑھانا اور اس کا اہتمام کرنا مطلوب نہیں بلکہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ حضور ﷺ کو صحابہ رضی اللہ عنہم سے عفو اور ان کے لیے استغفار کا اور ان کی دلجوئی کا حکم فرماتے ہیں۔ پس اصل مقصود تو ﴿فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ﴾ ''تو آپ ان کو معاف کر دیجئے اور ان کے لیے استغفار کر دیجئے اور خاص خاص امور میں آپ ان سے مشورہ لیتے رہا کیجئے اور ﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ﴾ ''بعد اس کے خدا ہی کی رحمت کے سبب سے آپ ان سے نرم رہیے'' اس کی تمہید ہے خود مسوق لہ الکلام اور مقصود نہیں(۷) جس سے لین کی ترغیب(۸) پر استدلال کیا جاسکے۔ پس معنی یہ ہوئے کہ آپ ہمیشہ سے ان کی مصلحت افاضہ کے لیے ان کے ساتھ نرمی فرماتے رہے جس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ فظاظت اور غلظت(۹) کے لوازم میں سے انفضاض ہے اور یہاں انفضاض نہیں ہوا(۱۰) معلوم ہوا کہ آپ فظ اور غلیظ القلب نہیں(۱۱)۔ پس اس سے تاکید ہوئی آپ کے لین کی۔ پس آپ ہمیشہ سے ان کے ساتھ نرم رہے ان کو یہی عادت ہوگئی اب بھی

(۱) سختی کی مکمل طور پر ممانعت ہے (۲) نرمی اختیار کرنے کی ترغیب ہے (۳) سختی اور درشتی کی ممانعت ہے (۴) ایک بے بنیاد بات پر دوسری بات کی بنیاد رکھی گئی (۵) آیت ان معنی پر دلالت ہی نہیں کرتی (۶) مخلوق کو جمع کرنا (۷) اس غرض کے لیے یہ کلام نہیں لایا گیا (۸) نرمی کی ترغیب پر دلیل پکڑی جائے (۹) سختی اور درشتی کی بنا پر لوگ منتشر ہوجائیں گے (۱۰) یہاں منتشر نہیں ہوئے (۱۱) آپ تند خو اور سخت دل نہیں۔

اس عادت کے موافق برتاؤ کیجئے اور معاف کردیجئے تو یہاں تمہید اُلین کی خبر ہے۔ لین کا امر مقصود نہیں گو ضمناً وہ بھی مفہوم ہوتا ہے یہ ہے آیت کا مطلب مگر اہل غرض کو فہم کہاں اور ان کو ضرورت بھی کیا ہے غور و فہم کی۔

چوں غرض آمد ہنر پوشیدہ شد صد حجاب از دل بسوئے دیدہ شد(۱)

ان لوگوں نے نہ معلوم کس طرح آیت سے یہ مطلب نکال لیا کہ اجتماع کے لیے نرمی برتنا چاہیے اور اجتماع اور اس کا اہتمام مطلوب ہے دوسرے اگر بالفرض آیت کا وہی مطلب مان لیا جاوے جو یہ لوگ سمجھتے ہیں تو ایک بڑا فرق حضور ﷺ اور ان شیخ صاحب میں یہ ہے کہ حضور ﷺ سے وابستہ ہونے میں تو ہدایت منحصر تھی کیونکہ حضور ﷺ کی شان یہ تھی ہدایت کے باب میں کہ

عزیز یکہ در کہش سر بتاف بہر درکہ شد ہیچ عزت نیافت(۲)

وجہ یہ کہ نبی سے منقطع ہونے میں نجات کی کوئی صورت ہی نہیں۔ اب یہ شیخ صاحب بتلائیں کہ کیا ان کے ساتھ وابستہ ہونے میں بھی ہدایت خلق منحصر ہے(۳) اگر ہے تو اس کی دلیل بیان کریں اور اگر نہیں تو پھر وہ کس لیے یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم نرمی نہ کریں تو مخلوق ہدایت سے محروم ہوجائے گی، آخر کیوں محروم ہوجائے گی؟ کیا آپ کے سوا اور کوئی ہادی نہیں؟ پس اس فرق کی وجہ سے بھی ان کا استدلال آیت سے تام نہیں کیونکہ حضور ﷺ کے ساتھ مخلوق کے وابستہ ہونے کی ضرورت تھی جو یہاں نہیں۔

ایک لطیفہ

اس پر ایک لطیفہ یاد آیا کہ عمر اخاں جو ایک سرحدی نواب تھے جب حج کو گئے تو ممبئی میں گورنر کو مزاج پرسی کا حکم دیا گیا، گورنر آیا اور مزاج پرسی وغیرہ کرکے چلا گیا اور خان صاحب اس کی تعظیم کو اُٹھے تک نہیں۔ سہارن پور کے ایک رئیس بھی ہمراہ تھے اور انہیں سے یہ حکایت منقول ہے۔ انہوں نے کہا کہ مہمان کا اکرام مسنون ہے گو کافر ہی

(۱) ’’جب غرض آجاتی ہے ہنر پوشیدہ ہوجاتا ہے، دل سے سینکڑوں پردے آنکھوں پر پڑجاتے ہیں‘‘ (۲) ’’ایسا غالب حسن جس نے اس کی درگاہ سے سر پھیرا جس دروازہ پر گیا کچھ عزت نہ پائی‘‘ (۳) مخلوق کی ہدایت منحصر ہے۔

مہمان کیوں نہ ہو رسول اللہ ﷺ نے کافر مہمانوں کا بھی اکرام فرمایا ہے تو آپ نے اس کی مُدارات کیوں نہ کی؟ عمر اخان نے جواب دیا کہ سنو جی حضور ﷺ نے کافر مہمانوں کا اکرام کیا ہے تو آپ کو پیغمبری کرنا تھی اور مجھ کو پیغمبری کرنا تھوڑا ہی ہے جو میں کافروں کا اکرام کروں یہ کلام عنوان کے اعتبار سے تو پٹھانوں جیسا ہے کہ الفاظ کیسے بے ڈھب ہیں مگر مضمون شیخوں جیسا ہے یعنی محققانہ مطلب یہ تھا کہ حضور ﷺ سے بددل ہونے میں تو مخلوق کا ضرر تھا کہ وہ ہدایت سے محروم رہ جاتے اس لیے حضور ﷺ کو اکرام کرتے تھے اور مجھ سے بددل ہو کر کسی کا کیا بگڑے گا اور اگر اس کے دل میں اس کے سوا اور کچھ مطلب تھا تو میں اس کا ذمہ دار نہیں مگر ہم تو شاہی کلام کے اچھے ہی معنی لیں گے۔ بالخصوص جبکہ ایک مسلمان بادشاہ کا ہو۔ اب میں عود کرتا ہوں اصل مضمون کی طرف کہ حضور ﷺ صحابہ رضی اللہ عنہم کے متعلق یہ امر کیا گیا ہے کہ ان کو آپ کے فیوض کی حاجت ہے جس کے لیے آپ کے انشراح کی ضرورت ہے (۱) اس لیے آپ ان کی خطا معاف کر دیجئے اور اس لغزش کی وجہ سے جو درمیان میں انقباض (۲) اور عدم انشراح کا برتاؤ ہوا ہے اس کو موقوف کر دیجئے۔

جلالت جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

سبحان اللہ اس آیت سے رسول اللہ ﷺ کی جلالت شان (۳) کس درجہ ظاہر ہوتی ہے حالانکہ صحابہ رضی اللہ عنہم کا قصور خدا تعالیٰ نے معاف کر دیا ہے اور جب خدا تعالیٰ نے معاف کر دیا تھا تو کیا اس کے بعد حضور ﷺ معاف نہ فرماتے، ضرور معاف فرماتے مگر پھر بھی حضور ﷺ کو ارشاد ہوتا ہے کہ آپ بھی ان کو معاف فرما دیں۔ مطلب اسکا یہ ہے کہ آپ ان کو اپنے معاف کر دینے کی بھی اطلاع کر دیجئے تا کہ ان کی پوری تسلی ہو جائے۔ یہ مطلب نہیں کہ حق تعالیٰ کی معافی کے بعد بھی حضور ﷺ کے معاف نہ کرنے کا احتمال تھا ہرگز نہیں کیونکہ حضور ﷺ تو رضائے حق کے تابع تھے جب حضور ﷺ کو یہ معلوم ہو گیا کہ حق تعالیٰ ان سے راضی ہو گئے تو حضور ﷺ کیونکر ناراض رہتے جس سے محبوب راضی ہو جائے اس سے محبّ کس طرح ناراض رہ سکتا ہے کسی طرح نہیں اور حضور ﷺ کی تو شان بڑی ہے۔ عام اولیاء رضائے حق میں فنا ہوتے ہیں،

(۱) آپ کے دل کا کھلا ہوا ہونا ضروری ہے (۲) رکاوٹ (۳) عظمت شان۔

جدھر حق تعالیٰ کی مرضی دیکھتے ہیں ادھر ہی ہوجاتے ہیں حتی کہ حوادث دنیا میں بھی۔

جدھر مولا ادھر شاہ دولا

چنانچہ ایک بزرگ تھے شاہ دولا ان کے گاؤں میں سیلاب چڑھ آیا، گاؤں والوں نے آپ سے دعا کے واسطے عرض کیا تو آپ نے فرمایا کہ میرے ساتھ دریا پر چلو اور پھاوڑے(۱) ساتھ لے چلو، لوگوں نے ایسا ہی کیا، دریا پر پہنچ کر آپ نے گاؤں کی طرف پانی کا راستہ کھدوانا شروع کیا، لوگوں نے امر کی وجہ سے مہورا کھودا(۲) اور عرض کیا کہ حضرت اس طرح تو سیلاب گاؤں کی طرف جلدی آجاوے گی، آپ نے فرمایا جدھر مولا ادھر شاہ دولا مگر اگلے دن دیکھا تو دریا کو گاؤں سے ہٹا ہوا پایا، لوگ بہت خوش ہوئے اور اس کا سبب دریافت کیا کہ ہم نے راستہ کھودا تو تھا گاؤں کی طرف کو اور پانی ہٹ گیا دوسری طرف کو، اس کی کیا وجہ ہے، فرمایا اس وجہ سے کہ یہاں تک آکر واپس جانا تھا تم خواہ مخواہ گھبرانے لگے میں نے کہا لاؤ جلدی ہی یہاں تک پہنچا دیا جائے تو جلد ہی واپس چلا جاوے گا اس واسطے گاؤں کی طرف کو راستہ کھدوایا تھا۔

در نیاید حال پختہ ہیچ خام پس سخت کوتاہ باید والسلام(۳)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حال

جب بزرگوں کا یہ حال ہے جو حضور ﷺ کے غلامان غلام ہیں تو پھر رسول اللہ ﷺ خدا تعالیٰ کے خلاف کیسے ہوسکتے ہیں بلکہ آنحضرت ﷺ تو متابعت حق میں اتنے بڑھے ہوئے تھے کہ خدا تعالیٰ خود حضور ﷺ کی خواہش پوری کرنے لگے۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں: (ما اری ربك الا یسارع هواك) ''میں دیکھتی ہوں کہ تمہارے رب تمہاری خواہش کو جلدی پورا کردیتے ہیں'' واقعی اتباع کامل سے غلام کی یہی شان ہوجاتی ہے کہ آقا خود اس کی رعایت کرنے لگتا ہے کسی نے خوب کہا ہے:

(۱) مٹی کھودنے کا آہنی آلہ جس میں پکڑنے کے لیے بانس لگا ہوتا ہے (۲) اس حکم کی وجہ سے لوگوں نے راستہ کھودنا شروع کیا (۳) ''جب خام پختہ کے حال کو نہیں سمجھ سکتا تو تطویل کلام سے کیا فائدہ، سلامتی اسی میں ہے کہ ان فضا میں سے سکوت کیا جائے''۔

تو چنیں خواہی خدا خواہد چنیں میدہد یزداں مراد متقیں (۱)

ایک علمی نکتہ

اس جگہ ایک نکتہ اہل علم کے لیے بیان کرتا ہوں کہ حضور ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے واسطے یوں دعا فرمائی: (اللھم ادرس الحق معه حیث دار) (۲) یہ نہیں فرمایا کہ حق کی طرف ان کو کردے اس میں اسی مقام مرادیت کی طرف اشارہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ اگر ان سے کبھی اجتہاد کی غلطی بھی ہوجاوے تو آپ اسباب ایسے پیدا کردیجئے کہ ان کی بناء پر حق علیؓ کی طرف ہوجاوے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ ناحق کو حق بنادیا جائے، نہیں! بلکہ صورت ایسی پیدا ہوجائے کہ جو حضرت علیؓ کریں یا کہیں وہیں حق ہوجائے مثلاً مدعی نے غلط دعویٰ کیا اور حضرت علیؓ نے اجتہادی خطا سے اس کو غالب کردیا۔ یہ ظاہر میں خلاف حق ہوا مگر پھر مقدمہ میں مظلوم نے زیادتی شروع کردی جس سے ظالم مظلوم ہوگیا تو حق علیؓ کی طرف ہوگیا۔ خوب سمجھ لو یہ احادیث کے لطائف ہیں جو صوفیہ کے علوم سے حاصل ہوتے ہیں مگر جہلاء صوفیہ کے لطائف معتبر نہیں جاہل صوفی تو بالکل ڈوب گئے اور ظاہری مولوی بالکل کورے رہ گئے (۳) مگر اتنی غنیمت ہے کہ کورے (۴) نہیں ہیں۔ بہرحال جب یہ برکت ہے اتباع نبوی ﷺ کی کہ اس کی بدولت آدمی رضائے حق کی طرف خود بخود ہوجاتا ہے تو پھر بھلا حضور ﷺ تابع رضا کیوں نہ ہوتے یعنی خدا نے جب (عفاالله عنهم) ''اللہ تعالیٰ نے ان کو معاف کردیا'' فرمایا تو حضور ﷺ صحابہ رضی اللہ عنہم کی خطا کیوں معاف نہ فرماتے؟۔

فَاعْفُ عَنْهُمْ کی حکمت

بس فقط تطییب قلب کے لیے صحابہ رضی اللہ عنہم کو اس کی اطلاع کی ضرورت تھی کہ حضور ﷺ نے بھی معاف کردیا کیونکہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے اس طبعی رنج کے ازالہ کا طریقہ یہی تھا کہ حضور ﷺ بھی زبان مبارک سے معاف فرمادیں۔ (لقد عفوت عنکم) ''میں نے تم کو معاف کردیا'' کیونکہ عاشق کو بدوں اس کے تسلی نہیں ہوتی اس

(۱) ''جیسا تو چاہتا ہے ایسا ہی خدا چاہتے ہیں، اللہ تعالیٰ متقیوں کی مراد پوری کرتے ہیں'' (۲) ''یعنی اے اللہ علی جدھر ہوں حق کو ادھر ہی کردیجئے'' (۳) خالی بغیر کمال کے (۴) اندھے۔

لیے چاہیے کہ اگر کوئی شخص کسی سے معافی مانگے تو اس کی خاطر سے اتنا کہہ دے کہ میں نے معاف کر دیا۔ گو واقع میں اس کی خطا بھی نہ ہو بعض لوگ ایسے خشک ہوتے ہیں کہ بار بار یوں ہی کہتے رہتے ہیں کہ تم نے کیا ہی کیا ہے، کس بات کو معاف کروں اور معاف کر دینے کا لفظ زبان پر نہیں لاتے حالانکہ دوسرے کی تسلی کے لیے اس کی ضرورت ہے کہ صاف الفاظ سے معاف کر دے تاکہ اس کی کھٹک نکل جاوے اگر معاف کر دینے میں زیادہ ہی شرم آوے کہ اس میں مخاطب کو قصوروار ٹھہرانا ہے تو یوں کہہ دو کہ گو تم نے کچھ کیا نہیں مگر تمہارے کہنے سے کہے دیتا ہوں کہ معاف کیا اور میرے مذاق پر (لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ) ''تاکہ اللہ تعالیٰ آپ کے لیے بخش دیں'' میں بھی یہی نکتہ ہے کہ حضور ﷺ اپنے کو قصوروار سمجھتے تھے اس لیے حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر آپ اپنے کو قصوروار ہی سمجھتے ہیں تو ہم نے سب قصور معاف کر دیا اس سے مقصود محض حضور ﷺ کی تسلی کرنا ہے اس آیت کی تو جیہیں اور بھی ہیں مگر میں تو اپنی ہی چھاچھ[1] کو میٹھی کہتا ہوں۔ پس (فَاعْفُ عَنْهُمْ) ''آپ ان کو معاف کر دیجئے'' کی حکمت معلوم ہوگئی کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی تسلی تھی اس کے بعد فرماتے ہیں (وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ) کہ آپ ان کے واسطے استغفار کیجئے۔

جلالت شان رسول اکرم ﷺ

اس میں اول تو حضور ﷺ کی جلالت شان کا اظہار ہے کہ مسلمانوں کو متنبہ کر دیا گیا کہ تمہاری معافی کی تکمیل حضور ﷺ کے استغفار کے بعد ہوگی۔ دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم کی تطییب قلب ہے کیونکہ وہ اکثر خطاؤں کے لیے حضور ﷺ سے استغفار کی درخواست کیا کرتے تھے اور اس واقعہ میں خطا ایسی ہوئی تھی جس سے حضور ﷺ ہی کو ملال پہنچا[2]۔ اس لیے اس واقعہ میں وہ خود استغفار کی استدعا کرتے ہوئے شرماتے مگر طبعًا ان کو یہ ضرور خیال ہوتا کہ اگر حضور ﷺ نے ہمارے لیے استغفار نہ کیا تو اس درجہ کی معافی نہ ہوگی جو حضور ﷺ کے استغفار کے بعد ہوتی کیونکہ قاعدہ ہے کہ کریم کے بیٹے کی سفارش پر کچھ زائد ہی مل جاتا ہے اور حق تعالیٰ تو اولاد سے پاک ہیں مگر حضور ﷺ سے حق تعالیٰ کو ایسی محبت ہے کہ کسی باپ کو اولاد سے بھی نہ ہوسکتی اس لیے

(۱) کچی لسی (۲) رنج ہوا۔

حضور ﷺ کی سفارش کے بعد مغفرت کاملہ کی یقینی امید ہے۔

عظمت صحابہؓ

واقعہ یہ ہے کہ قرآن میں اس کے حروف سے بھی زیادہ علوم ہیں اور یہ بات بالکل بلامبالغہ ہے مگر ان علوم کے سمجھنے کے لیے ضرورت ہے توفیق خداوندی کی جس کا ایک شعبہ علم عربی بھی ہے تو علوم محض توفیق سے عطا ہوتے ہیں۔ تیسرا نکتہ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ (آپ ان کے واسطے استغفار کیجئے) میں یہ ہے کہ حضور ﷺ کی معافی سے صحابہ رضی اللہ عنہم کو یہ تو معلوم ہوگیا کہ آپ ﷺ نے خطا معاف کردی مگر اس سے وہ اجنبیت کیسے دور ہوگی جو خطا سے پیدا ہوگئی تھی اس کے لیے تو خصوصیت کی ضرورت ہے ورنہ معافی کی تو ایک یہ بھی صورت ہے کہ کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق دیکر کہدے کہ ہم نے سب خطائیں معاف کیں۔ کیا اس معافی سے تعلقات شگفتہ ہوگئے ہرگز نہیں تو حق تعالیٰ نے (فَاعْفُ عَنْهُمْ) ''آپ ان کو معاف کردیجیے'' کے بعد (وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ) ''آپ ان کے لیے استغفار کیجئے'' بڑھا کر یہ بتلایا ہے کہ صرف عفو خطا کافی نہیں بلکہ اس کی بھی ضرورت ہے کہ آپ ﷺ صحابہ رضی اللہ عنہم سے خصوصیت کا برتاؤ کریں کہ پہلے کی طرح اس واقعہ میں بھی ہم سے ان کی مغفرت کی درخواست کریں۔ ونیز ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ اوپر جیسا دوسرے نکتہ میں بیان ہوا ہے کہ اس واقعہ میں صحابہ یہ خود کیسے کہتے کہ ہمارے واسطے استغفار کردیجئے وہ یہ سمجھے ہوئے تھے کہ حضور ﷺ ہی خود ہم سے خفا ہیں۔ پس جب وہ یہ عرض نہ کرسکے تو خدا نے ان کا کام کردیا۔ حاصل اس نکتہ کا صحابہ رضی اللہ عنہم کی شان تفویض کا اور اس کی برکات کا اظہار ہے۔ جیسا کہ بچہ کے سب کام کردیئے جاتے ہیں کیونکہ وہ خود نہیں کرسکتا۔

طفل تا گیر اوتا پویا نبود مر کبش جز گردن بابا نبود(۱)

یعنی چونکہ بچہ ہاتھ پاؤں سے کچھ کام نہیں کرسکتا اس لیے حق تعالیٰ خود اس کے سارے کام بنادیتے ہیں اور جب خود کرنے لگے اس کا بوجھ اسی پر ڈال دیتے ہیں۔ بس جس نے یہ نکتہ نہ سمجھا وہ مفلوج ہوگیا مگر تم خود اپنی رائے سے مفلوج نہ بننا بلکہ کسی

(۱) ''بچہ جب تک ہاتھ سے پکڑنے کے اور پاؤں سے چلنے کے قابل نہیں ہوتا تو باوا کی گردن پر چڑھا پھرتا ہے''۔

محقق شیخ کی اجازت سے ایسا کرنا چاہیے اور حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم پر اپنے کو قیاس نہ کرنا چاہیے کیونکہ صحابہ رضی اللہ عنہم حدود کو جانتے تھے اس لیے ان کی خاموشی بدون صریح اجازت کے بھی محدود تھی۔ بہرحال (وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ) ''آپ ان کے لیے استغفار کیجئے'' میں خصوصیت کے برتاؤ کا امر ہے اور انہیں خصوصیات میں سے یہ بھی ہے کہ (وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ) ''اور آپ خاص خاص باتوں میں ان سے مشورہ کرلیا کیجئے'' کہ بعض معاملات میں جو محل ہیں مشورہ کے ان سے مشورہ کیا کیجئے۔ یہاں الامر میں لام عہد کا ہے اس کی توضیح کے لیے ایک مسئلہ بتلاتا ہوں وہ یہ کہ مشورہ ہر کام میں نہیں ہوا کرتا۔ چنانچہ جو کام خیر محض ہو کہ اس میں کسی ضرر کا احتمال ہی نہ ہو اس میں مشورہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ مثل مشہور ہے:

درکار خیر حاجت ہیچ استخارہ نیست(۱)

میں نے اس میں تصرف کر کے اس مصرعہ کو اس طرح بنایا ہے:

درکار خیر حاجت استشارہ نیست(۲)

اور دونوں کا ایک ہی مطلب ہے اگر شرک کا احتمال نہ ہو تو استشارہ اور استخارہ دونوں مسنون ہیں ورنہ نہیں۔

امور خیر میں استخارہ کا ثبوت

چنانچہ بعض احادیث سے ایسے امر خیر میں بھی استخارہ کا ثبوت معلوم ہوتا ہے جیسا کہ حضرت زینبؓ سے جب حضور ﷺ نے نکاح کا پیغام دیا تو انہوں نے کہا (حتی استخیر فیه ربی) کہ میں اللہ تعالیٰ سے اول استخارہ کرلوں۔ اب یہاں سے حضرت اُم المؤمنین زینبؓ کا فہم معلوم ہوتا ہے کہ جب حضور ﷺ نے ان کے پاس پیغام نکاح بھیجا تو جواب دیا کہ استخارہ کر کے عرض کروں گی۔ یہاں بظاہر شبہ ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کی خدمت میں اور آپ کے نکاح میں شر کا احتمال کہاں تھا جو استخارہ کی حاجت ہوئی اس نعمت عظمیٰ کو فوراً قبول کرلینا چاہیے تھا اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ بیشک حضور ﷺ کی خدمت تو خیر محض تھی مگر ہر شخص تو اس کا اہل نہیں ہوتا۔ بعض دفعہ خادم نااہل ہوتا ہے اس کی خدمت سے مخدوم کو راحت نہیں ہوتی اور بعض دفعہ خادم اہل ہوتا ہے لیکن مخدوم کا

(۱) ''کار خیر میں استخارہ کی کچھ ضرورت نہیں'' (۲) ''کار خیر میں مشورہ لینے کی ضرورت نہیں ہے''۔

مزاج بہت لطیف ہوتا ہے جس کی رعایت اس سے پوری طرح نہیں ہوسکتی جیسے حضرت مرزا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو شاہ غلام علی صاحب پنکھا جھلا کرتے تھے تو پنکھا ہلکا ہونے پر فرماتے کیا تمہارے ہاتھوں میں جان نہیں رہی اور اگر زور سے جھلتے تو فرماتے کیا مجھ کو اڑاؤ گے۔ اسی طرح ایک مرتبہ کہیں سے نوز آئے(۱) مرزا صاحب نے پکارا غلام علی وہ حاضر ہوئے تو فرمایا نوز لو، انہوں نے ہاتھ پھیلایا، کہا گنوار! کہیں نوز ہاتھ میں لیا کرتے ہیں کوئی کاغذ یا پتہ وغیرہ لاؤ وہ کچھ لائے اور اس میں نوز لیے اگلے روز دریافت کیا کہ کچھ نوز باقی ہیں۔ شاہ صاحب نے فرمایا حضور وہ تو کل ہی کھا لیے تھے تو فرمایا تم کیسے آدمی ہوں کہ ایک دن میں اتنا کھا گئے، میاں مٹھائی تو کھانے کے بعد ذرا سی کھا لیا کرتے ہیں۔ غرض مخدوم میں جتنی حس زیادہ ہوتی ہے اتنی ہی اس کو بات بات پر تکلیف ہوتی ہے اور اسی لیے تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ مجھ سے زیادہ کسی کو بھی ایذا نہیں دی گئی۔ حالانکہ نوح علیہ السلام کو جس قدر تکالیف دی گئیں۔ ظاہر میں معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کو اس قدر تکلیف نہیں پہنچی لیکن چونکہ حضور ﷺ حس اور لطافت سب سے زیادہ رکھتے تھے اس لیے واقعات سے حضور ﷺ پر زیادہ اثر ہوتا تھا۔ پس اب سمجھو کہ آنحضرت ﷺ کی خدمت گو خیر محض تھی مگر حضور ﷺ کی لطافت طبعی کی وجہ سے کسی خدمت کے خلاف مزاج ہونے سے حضور ﷺ کی تکلیف کا احتمال تھا۔ حضرت زینب اس نکتہ کو پہنچ گئیں اس لیے انہوں نے استخارہ کیا۔ غرض مشورہ کی ہر جگہ ضرورت نہیں اس لیے لام عہد سے فرمایا: (وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ای فی بعض الامر المعلوم لك)(۲) اور جہاں لام استغراق کا نہ ہو وہاں عہد ہی کا ہوتا ہے۔ آئمہ فن نے اس کی تصریح کی ہے بلکہ محققین کا قول یہ ہے کہ لام میں اصل عہد ہی ہے جہاں عہد نہ بن سکے وہاں دوسرے معانی پر محمول کیا جاتا ہے اور یہاں کوئی شخص یہ سوال نہیں کرسکتا کہ حضور ﷺ کو مشورہ کی حاجت تھی یا نہ تھی کیونکہ یہ امر تو صحابہ رضی اللہ عنہم کی تطییب کے لیے ہے باقی اصل مشورہ کی ضرورت سے سکوت ہے اور اس میں روایتیں مختلف ہیں، میں ان میں تطبیق دیتا ہوں۔

(۱) مٹھائی کی چھوٹی چھوٹی بنکیاں جو میدے سے بنائی جاتی ہیں جو ختم وغیرہ پر تقسیم کرنے کا رواج ہے

(۲) ''آپ ان سے مشورہ لیتے رہا کریں یعنی بعض امور میں جو آپ کو معلوم ہیں''۔

سرکار دو عالم ﷺ کے مشورہ فرمانے میں حکمت

ایک روایت میں تو یہ ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ مجھ کو مشورہ کی ضرورت نہیں مگر اُمت پر رحمت کے لیے کہ تطییب قلب بھی اس میں داخل ہے کر لیتا ہوں:

(اخرجه ابن عدی والبیهقی فی الشعب بسند حسن عن ابن عباس لما نزلت وشاورهم فی الامر قال رسول الله صلی الله علیه وسلم اما ان الله ورسوله یغنیان ولکن جعلها الله تعالی رحمة لامتی کذا فی روح المعانی)(۱)۔

اس کا مقتضا تو یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو حاجت مشورہ کی نہ تھی اور ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ، ابوبکر وعمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے مشورہ کے خلاف کوئی کام نہ کرتے تھے۔

(اخرجه الامام احمد عن عبدالرحمن بن غنم ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال لابی بکر وعمر لو اجتمعتما فی مشورة ما خلفتکما کذا فی روح العمانی ایضاً)(۲)

مراد انتظام و بعث عساکر وغیرہ کا کام(۳)۔ اس کا مقتضا یہ ہے کہ حضور ﷺ کو مشورہ کی ضرورت ہوتی تھی دونوں میں تطبیق یہ ہے کہ حضور ﷺ کو غالب اوقات میں تو مشورہ کی حاجت نہ ہوتی تھی کبھی کبھی اتفاقاً ضرورت پڑ جاتی تھی اور یہ بات شان نبوت کے خلاف نہیں بلکہ مناسب شان ہے۔ میں نے اس میں ایک نکتہ نکالا ہے کہ حضور ﷺ کو مشورہ کی حاجت ہونے میں (ولو فی بعض الاحوال) ''اگرچہ بعض حالتوں میں ہو'' حکمت ہے کیونکہ حاجت منافی الوہیت ہے(۴) اس میں حضور ﷺ کی شان شریف کا اظہار تھا کہ حضور ﷺ نبی ہیں الٰہ(۵) نہیں اور بعض علماء نے حضور ﷺ کے مشورہ کی حکمت تعلیم اُمت بیان کی ہے۔ اب مشورہ کے بعد حضور ﷺ کے اختیارات کی وسعت بیان

(۱) ''ابن عدی اور بیہقی نے شعب الایمان میں ابن عباسؓ سے سند حسن سے روایت کیا ہے جبکہ آیت وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تو مستغنی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے میری اُمت کے لیے اس کو رحمت بنا دیا ایسے ہی روح المعانی میں ہے'' الدر المنثور: ۹۰/۲ (۲) ''امام احمد نے عبدالرحمٰن بن غنم سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ابوبکر وعمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے فرمایا اگر تم دونوں کسی مشورہ میں متفق ہو جاؤ گے تو میں تمہاری مخالفت نہ کروں گا۔ ایسے ہی روح المعانی میں ہے'' (۳) انتظامی امور اور لشکر روانہ کرنے وغیرہ کے کام ہیں (۴) حاجتمند ہونے سے خدا ہونے کی نفی ہو گئی (۵) نبی ہیں خدا نہیں۔

فرماتے ہیں۔ (فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ) ''پھر جب آپ رائے پختہ کرلیں تو خدا پر اعتماد کیجئے'' اس میں مطلقاً یہ فرمایا ہے کہ مشورہ کے بعد جدھر آپ کا عزم ہو اپنے عزم پر عمل کیجئے اس میں کوئی قید نہیں ہے کہ حضور ﷺ کی رائے سب کے خلاف ہو یا ایک کے موافق اور اکثر کے خلاف ہو ہر حال میں توکلاً علی اللہ (اللہ پر بھروسہ کرکے) اپنے عزم پر عمل کرنے کے واسطے حکم فرمایا۔

قرآن حکیم سے سلطنت شخصی کا ثبوت

یہاں سے جڑ کٹتی ہے سلطنت جمہوری کی کیونکہ اس میں کثرت رائے پر فیصلہ ہوتا ہے اور محض مشورہ کرنے سے کثرت رائے پر فیصلہ کرنا لازم نہیں آتا اس لیے (وشاورھم) سے سلطنت جمہوری پر استدلال نہیں ہوسکتا اور اگر کھینچ تان کر کوئی اس سے استدلال کرتا بھی تو (فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ) ''پھر جب آپ رائے پختہ کرلیں تو خدا پر اعتماد کیجئے'' نے اس کو بالکل ہی اُڑا دیا اور اس سے مشورہ کو بیکار نہ کہا جاوے کہ جب اس پر عمل نہ کیا تو نفع ہی کیا ہوا، اور اصل مشورہ میں یہ فائدہ ہے کہ اس سے معاملہ کے ہر پہلو پر نظر پہنچ جاتی ہے اس کے بعد جو رائے ہوگی اس میں سب مصالح کی رعایت ہوگی اسی واسطے کہا گیا ہے: (رأیان خیرا من الواحد) ''دو رائیں ایک رائے سے بہتر ہیں'' یہ حاصل ہے مشورہ کا نہ یہ کہ عوام کی رائے کو بادشاہ کی رائے پر ترجیح دی جائے۔ جیسا کہ جمہوری سلطنت میں ہوتا ہے وہ بادشاہی کیا ہوا جو رعایا کی رائے پر مجبور ہوگیا۔ اسلام میں یہ حکم نہیں بلکہ اس کو پورے اختیارات ہیں۔ ہاں البتہ انتخاب سلطان کے وقت جمہور اہل حل وعقد کی کثرت رائے معتبر ہے جبکہ وہ رائے خلاف شرع نہ ہو۔ بہرحال (وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ) ''آپ بعض بعض باتوں میں ان سے مشورہ لیتے رہا کریں'' تو جمہوری سلطنت کی دلیل نہیں ہوسکتی۔ البتہ ایک اور آیت سے بظاہر اس پر استدلال ہوسکتا ہے شاید وہ کسی کے ذہن میں بھی نہ آئی ہو مگر میں اس کو بیان کرتا ہوں مع جواب کے کوئی صاحب فقط (لَا تَقْرَبُوْا) ''مت قریب جاؤ'' کو نہ دیکھیں بلکہ (وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى) ''اس حال میں کہ نشہ کی حالت میں ہوں'' کو بھی دیکھیں یعنی جواب کو بھی ساتھ ہی ساتھ ملاحظہ فرمالیں۔ وہ آیت یہ ہے: ﴿وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا

نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا﴾(۱)

اس میں حق تعالیٰ شانہ بنی اسرائیل پر انعام نبوت کے مضمون میں تو ارشاد فرماتے ہیں: (جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْبِيَآءَ) یعنی تم میں نبی بنائے اور انعام سلطنت کے بارے میں ارشاد ہے: (جَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا) یعنی تم سب کو بادشاہ بنایا اس سے معلوم ہوا کہ ان کی بادشاہت جمہوری تھی ورنہ یہاں بھی یوں فرمایا جاتا (جعل فیکم ملوکا) کہ تم میں بادشاہ بنائے جیسا کہ نبوت کے متعلق فرمایا یہ تو دلیل ہوئی اور اس کے دو جواب ہیں ایک عقلی ایک نقلی۔ عقلی جواب تو یہ ہے کہ فاتح قوم کا رعب شاہی عام ہوتا ہے۔ نیز جس قوم میں بادشاہت ہوتی ہے اس کے ہر فرد کا حوصلہ بڑھا ہوا ہوتا ہے اور ہر شخص اپنے کو فاتح اور سلطان سمجھتا ہے قوم مفتوح کے مقابلہ میں اس لیے (جَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا) ''تم سب کو بادشاہ بنایا'' فرمایا یہ نہیں کہ وہ سب کے سب بادشاہ تھے۔ اور نقلی دلیل یہ ہے کہ جب ہماری شریعت میں شخصی سلطنت کی تعلیم ہے تو اگر بنی اسرائیل کے لیے جمہوری سلطنت بھی مان لیں تو وہ منسوخ ہوچکی اور ہمارے لیے حجت نہیں ہوسکتی۔ غرض قرآن شریف سے تو سلطنت شخصی ہی ثابت ہوتی ہے۔ اب جو اہل اسلام میں جمہوریت کے مدعی ہیں وہ یاد رکھیں کہ ہمارے ذمہ شخصیت پر دلیل قائم کرنا لازم نہیں ہے بلکہ دلیل ان کے ذمہ ہے اور ہم تو مانع ہیں۔ پس جب وہ دلیل لاویں گے اس کا جواب بھی ان شاء اللہ ہم دے دیں گے۔

بعد مشورہ اللہ پر اعتماد کی ضرورت

اور میں پیش گوئی کرتا ہوں کہ وہ اپنے دعویٰ پر کوئی دلیل نہیں لاسکتے اور (فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ) ''خدا ہی پر اعتماد رکھئے'' میں یہ بھی بتلا دیا کہ باوجود مشورہ کرنے کے جو کہ اسباب رؤیت صواب سے ہے (۲) خدا ہی پر اعتماد رکھئے، مشورہ کے بعد بھی کام بنانے والا وہی ہے، مشورہ پر اعتماد نہ کرنا چاہیے۔ آگے فرماتے ہیں: (اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ) ''بے شک اللہ تعالیٰ اعتماد رکھنے والوں کو پسند فرماتے ہیں'' اس میں مسلمانوں کو امر وجوبی ہے توکل کا (۳) کہ ہر کام میں خدا ہی پر نظر رکھیں دلیل وجوب کی یہ ہے کہ یہاں یحب فرمایا

(۱) ''اور جب کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم! اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کو یاد کرو کہ تم میں نبی بنائے اور تم سب کو بادشاہ بنایا'' (۲) جو صحیح بات تک رسائی کا سبب ہے (۳) مسلمانوں کے لئے توکل کرنا واجب ہے۔

ہے جس سے مقابلہ کی بناء پر لازم آیا کہ (لا یحب غیر المتوکلین) وغیرہ (اعتماد نہ رکھنے والوں کو پسند نہیں فرماتے ہیں) اور قرآن کا محاورہ یہ ہے کہ لا یحب اپنے لغوی معنی پر مراد نہیں بلکہ بغض کے معنی میں ہے (یحب المتوکلین) کو (یبغض غیر المتوکلین) ''غیر اعتماد رکھنے والوں کو مبغوض رکھتے ہیں'' لازم ہے اور عدم توکل کا مبغوض ہونا دلیل ہے توکل کے وجوب کی البتہ توکل کے مراتب مختلف ہیں اس کا ہر درجہ فرض نہیں اس لیے یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ فرض کا درجہ کیا ہے اس کی تفصیل سنو۔

توکل کا درجہ فرض

توکل کا ایک درجہ تو یہ ہے کہ اعتقاداً ہر حال میں خالق پر نظر رہے اسی پر اعتماد ہو، یہ تو فرض ہے یعنی اسباب ہوں یا نہ ہوں ہر حال میں بھروسہ خدا پر ہو، اصلی کارساز اسی کو سمجھیں، اسباب پر نظر نہ رکھیں۔ دوسرا درجہ توکل کا علمی ہے یعنی ترک اسباب، اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر وہ سبب کسی ضروری مقصود دینی کے لیے ہے تو اس کا ترک حرام ہے جیسا کہ اسباب جنت میں سے نماز وغیرہ ہیں ان کا ترک جائز نہیں اور اگر مقصود دنیوی کا سبب ہے تو پھر اس میں بھی تفصیل ہے کہ اگر عادۃً اس مقصود کا توقف ثابت ہے اور وہ مسبب مامور بہ ہے تو اس کا ترک بھی حرام ہے جیسے کھانا سبب شبع ہے (۱) اور پانی پینا سبب ارتواء ہے (۲) ان اسباب کا ترک جائز نہیں اور اگر سبب پر مقصود دنیوی کا ترتب ضروری اور موقوف نہیں تو اقویاء (۳) کے لیے ایسے اسباب کا ترک جائز بلکہ بعض صورتوں میں افضل ہے اور ضعفاء (۴) کے واسطے ترک کی اجازت نہیں اور اگر وہ سبب محض وہمی ہے تو اس کا ترک سب کے لیے افضل ہے اور اگر اشتغال میں کوئی دینی ضرر (۵) ہے تو اس کا ترک واجب ہے خوب سمجھ لو۔ بہرحال مقصود آیت کا یہ ہے کہ حضور ﷺ ہمارے حق میں رحمت ہیں کہ حق تعالیٰ نے آپ کو نہایت کریم اور رحیم بنایا۔

یا رب تو کریمی ورسول تو کریم صد شکر کہ ہستیم میان دو کریم (۶)

(۱) پیٹ بھرنے کا سبب (۲) پیاس بجھنے کا سبب (۳) باہمت لوگوں کے لیے (۴) کمزوروں (۵) اگر اس میں مشغول ہونے میں کوئی دینی نقصان ہے (۶) ''اے اللہ آپ کریم ہیں اور آپ کے رسول ﷺ بھی کریم ہیں صد شکر کہ ہم دو کریموں کے درمیان ہیں''۔

اگر یہاں کسی کو حضور ﷺ سے سلسلہ ہے یعنی حضور ﷺ سے وابستگی ہے تو اس کے لیے آخرت میں سب کچھ امید ہے۔ تھوڑا سا تعلق بھی ہو تو ان شاء اللہ کافی ہے اور اگر یہ بھی نہ ہو تو پھر وہ اس شعر کا مخاطب ہے:

اس کے الطاف تو عام ہیں شہیدی سب پر تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

اب میں بیان کو ختم کرتا ہوں اور اس کا نام بمناسبت مضمون کے ''الرحمة علی الامة'' رکھتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ قبول فرماویں اور ہم سب کو اس رحمت میں شامل فرماویں۔ (اس کے بعد حسب معمول دعا مانگی)

کمالات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

اور بعد دعاء کے چلتے ہوئے فرمایا کہ تحدیث بالنعمۃ (۱) کے طور پر کہتا ہوں کہ ان مدعیان محبت رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں آپنے اتنے کمالات حضور ﷺ کے نہ سنے ہوں گے (اور مسکرا کر فرمایا) ہاں ہمارے ہاں مٹھائی نہیں ہے اس واسطے ہم کو محبّ نہیں کہا جاتا (اس کے بعد نماز پڑھائی اور بعد نماز کے فرمایا کہ ایک ضروری مضمون جو دراصل روح تھی اس بیان کی اس کو وقت پر بیان کرنا بھول گیا۔ اب بیان کرتا ہوں اہل فہم ذرا ٹھہرے رہے اور اس کا رہ جانا موجب تاسف ہوتا (گو اب بھی افسوس رہا کہ اس کمال نبوی ﷺ کا بیان مفصل نہ ہوا) مدلول لفظی تو اس کا واضح ہو چکا کہ اس میں معاملات مع الصحابہؓ کا ذکر ہے جس کے ضمن میں کمالات مستنبط ہوئے ہیں۔ حضور ﷺ کا ایک کمال اور بتلاتا ہوں اور اس کے واسطے ایک مقدمہ کی ضرورت ہے اور مقدمہ یہ ہے کہ بندے کو جو تعلقات پیش آتے ہیں وہ تین قسم کے ہیں ان میں دو کا حق ادا کرنا آسان ہے ایک ان تعلقات کا جو وجود کے ساتھ ہیں دوسرے ان تعلقات کا جو دشمنان خدا یعنی کفار کے ساتھ ہیں کیونکہ تعلق مع اللہ کا تو بڑھانا ضروری ہے اس میں تو یہی ایک کام ہے کہ اس تعلق کو بڑھایا جائے اور تعلق مع الکفار کا قطع ضروری ہے اس میں بھی ایک ہی کام ہے

(۱) جو نعمت اللہ نے عطا فرمائے اس کے شکریہ کے طور پر بیان کرتا ہوں۔

کہ اس کو قطع کیا جائے باقی رہے وہ تعلقات جو مومنین کے ساتھ ہیں بہت سخت ہے کیونکہ مومن میں دو شانیں ہیں ایک یہ کہ اس کو خدا سے تعلق ہے اور خدا تعالیٰ کو اس سے تعلق ہے یہ مقتضی ہے تعلق بڑھانے کو، اسکی دوسری شان یہ ہے کہ وہ غیر حق ہے یہ مقتضی ہے فصل کو، تفصیل اس کی یہ ہے کہ اس میں دو مقتضی متضاد ہیں تو مؤمن کے ساتھ اس درجہ سے تعلق مع اللہ ہی تعلق کرنا دوسرے غیر اللہ ہونے کی وجہ سے اس سے قطع تعلق کرنا اس لیے اس کی حدود بہت باریک ہیں اور اس کے ساتھ تعلق اور قطع تعلق دونوں کو جمع کرنا سخت دشوار ہے۔ اس آیت میں حضور ﷺ کو امر فرمایا گیا ہے کہ صحابہؓ کے ساتھ تعلق کی یہ حدود رکھو ظاہر میں ان کے ساتھ تعلق ہو ان سے مشورہ وغیرہ بھی ہو ان کی دلجوئی بھی ہو اور باطن میں صرف خدائے تعالیٰ پر نظر ہو اسی پر توکل اور اعتماد ہو مخلوق پر اس درجہ میں بالکل نظر نہ ہو، یہ ہے مجمل تقریر اس مضمون کی۔

بس حضور ﷺ کا یہ بہت بڑا کمال تھا کہ آپ سب حدود کی پوری رعایت رکھتے تھے کہ ایسی رعایت کسی سے ہو نہیں سکتی۔ حق تعالیٰ شانہ نے اس آیت میں مؤمنین کے اس حق کو یاد دلایا ہے کہ ان کے ساتھ بے تعلقی کے بعض شعبوں کو تو مبدل بہ تعلق کرنا چاہیے اور قطع کے شعبوں کا حق ادا کیا جائے حضور ﷺ اس پر پوری طرح عمل کرتے تھے وصل کے حقوق بھی ادا کرتے اور فصل کے حق بھی اور پھر اس کے ساتھ ایک اور بات بھی تھی کہ حضور ﷺ سلطان بھی تھے شانِ سلطنت کا مقتضا یہ تھا صحابہ پر حضور ﷺ کا رعب وجلال قائم ہو اور شان نبوت کا مقتضا یہ تھا کہ صحابہؓ کے دل حضور ﷺ سے کھلے ہوئے ہوں تا کہ استفاضہ ہو سکے۔ (۱) حضور ﷺ ان دونوں شانوں کے حقوق بھی ادا کرتے تھے کہ محض رعب ہی تھا کہ کوئی استفاضہ نہ کر سکے نہ ایسے بے رعب تھے کہ شان سلطنت کا حق فوت ہو۔

اب غور کیجئے کہ حضور ﷺ کو ان سب شیون (۲) کے حقوق ادا کرنے میں کس قدر دشواری ہوتی ہوگی۔ درحقیقت یہ امر دق من الشعر واحد من السیف ہے یعنی بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہے۔ محققین نے لکھا ہے کہ پل صراط اور اصل شریعت محمدیہ ﷺ کی صورت مثالیہ ہے جو شخص اس جگہ شریعت پر عامل ہے اس کو وہاں

(۱) آپ سے فیض حاصل کر سکیں (۲) ان سب باتوں کی ادائیگی میں۔

پل صراط پر چلنا آسان ہوگا ورنہ مشکل ہوگا اور گو اس میں سب مشترک ہے کہ شریعت کا جو درجہ متوسطہ ہے اس پر پوری طرح عمل کرنا مشکل ہے لیکن پھر بھی اس میں تفاوت ہے کہ بعضے درجہ وسط سے بہت قریب ہیں اور بعض بعید ہیں۔ پس اس کی اصلی حد پر جس طرح حضور ﷺ نے عمل کر کے دکھلا دیا وہ از بس دشوار ہے۔ اب غور کیجئے کہ ہماری خاطر سے حضور ﷺ نے کتنی دشواری کا تحمل گوارا فرمایا، کیا یہ رحمت نہیں؟ یقیناً بڑی رحمت ہے اور قیامت میں اس سے زیادہ کی امید حق تعالیٰ اپنی رحمت سے اپنے حبیب ﷺ کے طفیل ہماری امیدیں پوری فرمادے۔ آمین۔ (۱)

(۱) اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس وعظ کے تمام مضامین کو سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی محبت اور اتباع سنت نصیب فرمائے آمین۔

خلیل احمد تھانوی

۲۱ مارچ ۲۰۱۸ء